تعلیم و تربیت

فروری 1999ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

فروری 1999ء

پہلا دن

آپ جب پہلے دن اسکول گئے تھے تو آپ نے وہاں کیا کیا شرارتیں کی تھیں۔ آپ کی ان شرارتوں سے کون خوش ہوا اور کون ناراض' اور کیا سزا ملی۔ یہ شاید سب کچھ آپ بھول گئے ہوں' آیندہ ماہ عمر کے اسکول میں پہلے دن کی پوری کارروائی محترمہ بخت رسا صاحبہ کی زبانی سن کر آپ کو یہ سب کچھ یاد آجائے گا۔۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

ہماری میز پر آپ کے ڈھیر سارے پرخلوص عید کارڈ آپ کی تعلیم و تربیت سے محبت اور ہماری حوصلہ افزائی کا بہترین اظہار ہے۔ کسی کے اچھے کام پر شاباش دینے سے انسان کو اپنے پلے سے تو کچھ نہیں دینا پڑتا مگر اس سے کام کرنے والے میں مزید آگے بڑھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔

اس مہینے قسط وار ناول "دھوپ چھاؤں" ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اسے پسند کیا۔ اگلے ماہ مارچ 1999ء میں آپ کے سالانہ امتحان ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ امتحانوں کی تیاری خوب کر رہے ہوں گے۔ آپ کے امتحانوں کے بعد ہم آپ کو ایک اور دل چسپ اور سنسنی خیز ناول شروع کرنے کی خوش خبری سنائیں گے۔

ہمیں ہر ماہ بہت سارے ساتھیوں کے ایسے خطوط موصول ہوتے تھے جن میں سلسلہ "مجرم کون؟" شروع کرنے کا پرزور مطالبہ کیا گیا ہوتا۔ مگر اس بار تو اس بارے میں اتنے زیادہ خط موصول ہوئے کہ ہزاروں میں سے چند ایک خطوط ہی ایسے ہوں گے' جن میں یہ مطالبہ نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے آپ کی خواہش کے پیش نظر اس ماہ سے آپ کے من پسند سلسلے "مجرم کون؟" کا آغاز کر دیا ہے۔ اب آپ ہر ماہ اس کا بغور مطالعہ کر کے مجرم پکڑ کر ہمیں بتائیں۔ ہم آپ کا یہ کارنامہ تعلیم و تربیت میں شائع بھی کریں گے اور آپ کو انعام بھی دیں گے۔

سرورق: مقدر کی پہیلیاں

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

سالانہ قیمت: پاکستان میں رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ 165/- روپے
مشرق وسطیٰ' افریقہ (ہوائی ڈاک) سے 660/- روپے
یورپ (ہوائی ڈاک) سے 770/- روپے
امریکہ' مشرق بعید (ہوائی ڈاک) سے 890/- روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس' لاہور
فون: 6278816-6361309-6361310-6278815

دادی اماں نے مفلر بُنا

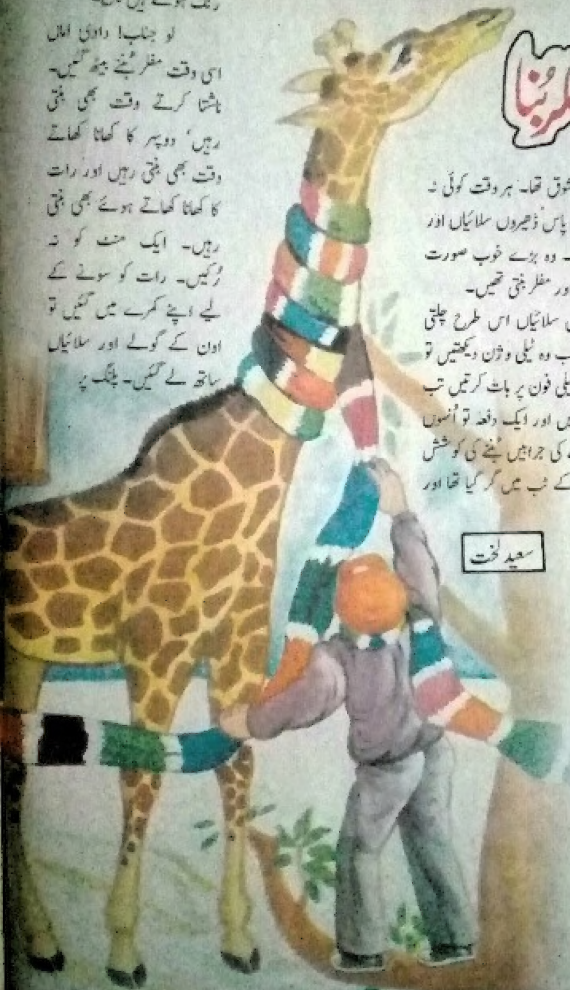

سعید لخت

دادی اماں کو بُننے کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز بُنتی رہتی تھیں۔ ان کے پاس ڈھیروں سلائیاں اور ڈھیر سارے اُون کے گولے تھے۔ وہ بڑے خوب صورت اور پیارے پیارے سویٹر، جُرابیں اور مفلر بنتی تھیں۔

دادی اماں کی اُنگلیوں میں سلائیاں اس طرح چلتی تھیں جیسے مشین چل رہی ہو۔ جب وہ ٹیلی وژن دیکھتیں تو اس وقت بھی بُن رہی ہوتیں۔ ٹیلی فون پر بات کرتیں تب بھی ان کی اُنگلیاں چل رہی ہوتیں اور ایک دفعہ تو اُنھوں نے باتھ روم میں بھی اپنے نواسے کی جرابیں بُننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اون کا گولا پانی کے ٹب میں گر گیا تھا اور ساری اون بھیگ گئی تھی۔

ایک دن دادی اماں اپنی الماری صاف کر رہی تھیں کہ انھیں الماری میں ایک بڑا سا بیگ ملا۔ اس بیگ میں نیلے، پیلے، ہرے، لال، اُودے، گلابی اور سفید اون کے بہت سے گولے بھرے ہوئے تھے۔ دادی اماں یہ بیگ الماری میں رکھ کر بھول گئی تھیں۔ اسے پا کر خوشی سے اُچھل پڑیں۔ انھوں نے سوچا کہ اُون کے ان رنگوں سے سات رنگوں کا ایک مفلر بُنوں گی۔ بالکل دھنک کی طرح۔ دھنک میں سات رنگ ہوتے ہیں ناں۔

لو جناب! دادی اماں اسی وقت مفلر بُننے بیٹھ گئیں۔ ناشتا کرتے وقت بھی بنتی رہیں، دوپہر کا کھانا کھاتے وقت بھی بنتی رہیں اور رات کا کھانا کھاتے ہوئے بھی بنتی رہیں۔ ایک منٹ کو نہ رُکیں۔ رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئیں تو اون کے گولے اور سلائیاں ساتھ لے گئیں۔ پلنگ پر

لیٹیں تب بھی بُنتی رہیں' اور جب سو گئیں تو سوتے میں بھی ان کی اُنگلیاں برابر چلتی رہیں۔ ایک سکنڈ کو نہ رُکیں۔

اور جب صبح کو جاگیں تو اس وقت بھی بُن رہی تھیں۔ انہوں نے اتنا لمبا مفلر بُنا تھا کہ آج تک کسی نے نہ بُنا ہو گا۔ اس کا ایک سرا ان کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا سرا کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا تھا۔

"اُف! میرے اللہ" دادی اماں سر پکڑ کر بولیں "اتنا بڑا مفلر کسی آدمی کے گلے میں تو آئے گا نہیں۔ یہ تو کسی دیو کا معلوم ہوتا ہے۔ اب مجھے اسے اُدھیڑنا پڑے گا"۔

وہ مفلر کو اُدھیڑنے لگیں تو یاد آیا کہ انہیں بازار سے ناشتا بھی تو لانا ہے۔ وہ ٹوکری لے کر باہر نکلیں۔ باہر بہت سردی تھی۔ ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی۔ دادی اماں نے گرم سویٹر پر اونی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی انہوں نے ہی بُنی تھیں۔

وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آئیں تو اُن کے قدم ایک دم رُک گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ انہوں نے عینک کے شیشے صاف کیے' اور پھر غور سے دیکھا۔ نہیں یہ خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔

سڑک پر ایک بڑا سا' اونچا سا زرافہ چلا جا رہا تھا۔ زرافہ کے گلے میں رسّی بندھی تھی اور رسّی کا سرا اس آدمی کے ہاتھ میں تھا جو زرافہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دسمبر کا مہینا تھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ زرافہ سردی سے کانپ رہا تھا۔

دادی اماں کو زرافے پر بڑا ترس آیا۔ انہوں نے اس آدمی سے کہا "تم کتنے بے درد ہو۔ اتنی سردی میں اسے ٹہلانے نکلے ہو۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی تو بیمار ہو جائے گا"۔

وہ آدمی بولا "یہ افریقہ سے آیا ہے۔ ابھی پانی کے جہاز سے اُترا ہے۔ میں اسے چڑیا گھر لے جا رہا ہوں۔ افریقہ گرم ملک ہے۔ یہ سردی کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے کانپ رہا ہے"۔

دادی اماں بولیں "یہیں ٹھہرو میں ابھی آئی"۔

وہ لپک جھپک گھر میں گئیں' وہاں سے مفلر اٹھا کر لائیں اور اس آدمی سے بولیں "یہ مفلر اس کے سر اور گردن پر لپیٹ دو۔ پھر اسے سردی نہیں لگے گی"۔

زرافہ کی گردن بہت لمبی تھی۔ آدمی کا ہاتھ گردن تک نہیں جا سکتا تھا۔ وہ زرافہ کو ایک درخت کے پاس لے گیا' اور درخت پر چڑھ کر زرافہ کے سر اور گردن پر مفلر لپیٹ دیا۔

"واہ وا!" دادی اماں خوش ہو کر بولیں "لگتا ہے یہ مفلر میں نے اسی کے لیے بُنا تھا۔ شکر ہے۔ میری محنت ٹھکانے لگی"۔ (ایلا بیکر کی کہانی سے ماخوذ)

حفیظ الرحمان احسن

بسنت بہار

ہے فضا میں ہر طرف اڑتی پتنگوں کی بہار
آسماں پر جس طرح چھائی ہو رنگوں کی بہار

جس طرف دیکھو پتنگوں کی ہے اک رنگیں قطار
گننا چاہو بھی تو ممکن ہی نہیں ان کا شمار

ہے بسنتی رت میں خوشیوں کی بہار آئی ہوئی
ہے فلک پر اک انوکھی کہکشاں چھائی ہوئی

سردیاں جانے کو ہیں اب اور بہار آنے کو ہے
سوکھے مرجھائے درختوں پر نکھار آنے کو ہے

اس بدلتی رت کا بھی اپنا عجب انداز ہے
ہر طرف ہیں رونقیں اور قہقہوں کا ساز ہے

ہیں بڑے بوڑھے، جواں بھی اور کم سن بھی بہت
ہے لگن سب میں پتنگ اونچی اڑانے کی بہت

میں بھی خوش ہوں، دیکھ کر خوشیوں کا یہ منظر، مگر
اس حسیں تفریح کے انجام پر بھی ہے نظر

زخم دے جاتا ہے کتنے ہی یہ منظر، ہر برس
چند لمحوں کی خوشی کے بعد وہ دکھ ہیں کہ بس!

کھیل اور تفریح کا انداز یہ اچھا نہیں
اس طرح کیوں آج تک ہم نے کبھی سوچا نہیں

ہم مسلماں ہیں، ہمیں خوشیاں بھی اچھی چاہئیں
غیروں کی رسمیں ہیں جتنی، چھوڑ دینی چاہئیں

پھینک کر ڈور اور پتنگیں ہم کتابیں تھام لیں
خوب محنت سے پڑھیں اس کا حسیں انعام لیں!

منزل کی تلاش

نعیم احمد بلوچ

اس عمارت کے سامنے سے وہ پچھلے کئی روز سے گزر رہا تھا لیکن آج جو آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں وہ بہت ہی دل چسپ تھیں۔ پہلے تو یہ عمارت ہی اسے کچھ عجیب سی لگی تھی مگر اب اس میں سے آنے والی پراسرار آوازوں کو سن کر تو وہ بہت ہی بے چین ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ ذرا اندر جا کر معلوم کرے کہ قصہ کیا ہے؟ شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔

آوازوں کا پیچھا کرتے وہ ایک کھلے ہال میں پہنچا۔ اس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ لوگ قطار بنائے کھڑے تھے اور ایک شخص کے کہے ہوئے الفاظ کو بڑی عقیدت سے دہرا رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ عبادت ہو رہی ہے۔ اسے ان لوگوں کا یوں عبادت کرنا بڑا بھلا لگا۔ وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ اس منظر میں اس قدر کھو چکا تھا کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ تو کھیتوں میں کام کرنے جا رہا تھا۔

دراصل اس کے والد کو اپنے مکان کی مرمت کے لیے گھر ہی میں رکنا پڑا تھا اور پچھلے چند روز سے وہ اپنے والد کی جگہ کھیتوں میں کام کرنے جا رہا تھا۔ یوں تو ہر روز اس عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ اس کے اندر جا کر دیکھے لیکن والد کی تاکید اور نصیحت اس کے قدم روک دیتی۔ مگر آج وہ مجبور ہو کر اندر چلا گیا تھا۔

وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کا اپنا مذہب آگ کی پوجا کرنا ہے۔ اسے اپنے مذہب سے بہت پیار تھا اور اس نے گھر کے آتش کدے میں آگ کو کبھی بجھنے نہیں دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی عبادت کے طریقے نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔

جب عبادت ختم ہوئی تو ایک شخص اس کے قریب آیا، پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ وہ کون ہے؟

اس نے بتایا کہ اس کا نام مابہ ہے اور وہ اس بستی کے سب سے بڑے آتش پرست کا بیٹا ہے۔ مابہ نے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس شخص پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس شخص نے بڑی محبت سے اس کے تمام سوالوں کے جواب دیے۔ مابہ شام تک وہاں رہا۔

گھر پہنچا تو باپ نے ڈانٹ کر پوچھا کہ وہ آج اتنی دیر سے گھر کیوں آیا ہے۔ جھوٹ بولنا تو مابہ نے سیکھا ہی نہ تھا۔ سچ سچ سب کچھ کہہ ڈالا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ جن لوگوں کی عبادت گاہ کو دیکھ کر آیا ہے اسے ان کا مذہب بہت اچھا لگا ہے۔

باپ نے یہ سن کر بیٹے کو بہت سمجھایا کہ ان کا مذہب آتش پرستی سے اچھا نہیں ہے لیکن باپ کی بات اس کے دل کو نہ لگی۔ اگلے دن وہ چھپ کر دوبارہ اس عبادت خانے میں پہنچ گیا۔

مابہ کے باپ کو بھی علم ہو گیا اور اس نے اسے بہت برا بھلا کہا اور خبردار کیا کہ آئندہ اگر اس نے اس جگہ کا رخ کیا تو اس کو گھر میں

قید کر دیا جائے گا۔ لیکن اس پر نئے مذہب کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ اگلے روز پھر کھیتوں کو جانے کے بجائے مابہ نے اسی عبادت گاہ کا رخ کیا۔ آج وہ یہ بات دل میں ٹھان کر آیا تھا کہ اس نئے مذہب کی تفصیل ضرور معلوم کرے گا۔ عبادت گاہ میں موجود تمام لوگ عبادت سے فارغ ہو کر جب واپس اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے تو وہ اسی شخص کے پاس چل دیا جس سے کل اس کی گفتگو ہوئی تھی۔

مابہ کے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ ان لوگوں کا تعلق عیسائی مذہب سے ہے اور اس عبادت گاہ کو وہ لوگ گرجا گھر کہتے ہیں۔ مابہ دیر تک اس شخص سے باتیں کرتا رہا جسے سب لوگ "پادری" کہہ کر پکارتے تھے۔ پادری نے اسے یہ بھی بتایا کہ ان کے مذہب کا مرکز اس وقت شام ہے اور اگر وہ عیسائیت میں دلچسپی رکھتا ہے تو اسے وہیں جانا ہو گا۔ وہاں اسے مذہب کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

جب مابہ گرجا گھر سے باہر نکلا تو اس کے باپ کا ایک جاسوس چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ آج بھی کھیتوں میں کام کیے بغیر ہی گھر لوٹ رہا ہے۔ مابہ کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی شکایت ہو چکی تھی۔ یوں جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا باپ کی گرج دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "مابہ کہاں تھے؟"

یہ سوال سن کر وہ سہم کر بولا "میں گرجا گھر گیا تھا"۔

"کیوں؟ میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا؟" باپ کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

مابہ نے ادب سے کہا "میں نے آپ سے کل ہی کہا تھا کہ وہ مذہب آتش پرستی سے کہیں بہتر ہے۔ بھلا ایسی چیز کی عبادت کا کیا فائدہ جسے ہم اپنی مرضی سے جلا اور بجھا سکتے ہیں"۔

بیٹے کی بات سن کر باپ آپے سے باہر ہو گیا۔ "تمہیں اس گستاخی کی سزا ضرور ملے گی" اس نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔

مابہ جب اگلے روز نیند سے بیدار ہوا تو اسے اپنے پاؤں میں بھاری پن محسوس ہوا۔ اس نے بستر سے اٹھنا چاہا لیکن ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ واپس بستر پر آ رہا۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس کے پاؤں تو بیڑیوں میں جکڑ دیے گئے ہیں۔ گویا اس کے والد نے خالی دھمکی نہیں دی تھی بلکہ وہ اپنی بات میں بالکل سنجیدہ تھا۔

وہ ایک نہایت عجیب و غریب اور غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس کے باپ کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنے بیٹے سے اس قدر پیار کرتا تھا کہ اس پر جان چھڑکنے کے لیے بھی تیار رہتا مگر دوسری طرف اس نے اسے قید بھی کر دیا تھا۔ تبھی اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے باپ کا پیار کھوکھلا ہے۔ اسے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ کوئی اور چیز عزیز ہے۔ اور وہ تھی آگ اور اس کی پوجا! اس موقع پر اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ ایسا فیصلہ جو اسے اپنے باپ کے جھوٹے اور خود ساختہ مذہب سے بچا کر حقیقت اور سچائی کی طرف لے جا سکتا تھا۔

دوپہر کے وقت اس کے باپ کا نوکر اس کے لیے کھانا لے کر آیا۔ وہ کھانا بھی کھا رہا تھا اور نوکر سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کر رہا تھا۔ اس دوران میں جب نوکر نے اسے بتایا کہ ملک شام سے تاجروں کا ایک قافلہ ان کے شہر اصفہان آیا ہے تو وہ چونک گیا۔

"اچھا!" اس نے حیرت سے کہا۔ "کتنے دن رکے گا؟"

"سنا ہے کہ آج کل میں روانہ ہو جائے گا۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں چھوٹے مالک؟" نوکر نے دریافت کیا۔

"بس ایسے ہی"۔

نوکر کے جانے کے بعد اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے پاس صرف آج کا دن تھا۔ اسے ہر صورت کچھ کرنا تھا ورنہ ایسا موقع شاید دوبارہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ انسان جب کسی چیز کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لے اور اس کا مقصد نیک ہو تو خدا مدد ضرور کرتا ہے۔ پس خدا نے مابہ کے نیک مقصد میں اس کی بھی مدد کی۔

ہوا یوں کہ اس کا باپ بیٹے کی محبت میں اس رات اس سے ملنے آیا۔ بیٹے کو بیڑیاں پہنا کر وہ خوش نہیں بلکہ بہت غمگین تھا، لیکن اپنی کمزوری بھی اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنی عبا اتار کر ایک طرف رکھی، قمیص کی آستینیں چڑھائیں اور بیٹے کو سمجھانے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "بیٹا" اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں، خیر خواہ ہوں۔ میں تمہیں بیڑیاں پہنا کر ہرگز خوش نہیں ہوں۔ میرا اصل مقصد تمہاری اصلاح کرنا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر بولا "بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ جس مذہب کو تمہارے باپ دادا اور ان سے بھی پچھلی کئی پشتوں نے

اپنایا، اسے تم ایک دم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لو"۔

"لیکن بابا، مجھے آتش پرستی بالکل پسند نہیں، میں..."

"بیٹا، سمجھنے کی کوشش کرو" باپ نے کہا "بیٹے ذرا سوچو تو اگر تم نے آگ کی پوجا ترک کر دی تو تمہارے آباؤ اجداد کی روحیں کس قدر ناراض ہوں گی۔ اور اگر وہ ناراض ہو گئیں تو..." غرض باپ نے بیٹے کو قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی، لیکن بیٹے کو باپ کی کسی بات میں وزن معلوم نہ ہوا۔ اسے باپ کی ہر دلیل بالکل کھوکھلی اور بے تکی محسوس ہوئی۔ مابہ کے چہرے کے تاثرات سے اس کے ارادے جاننا مشکل نہ تھا۔ اس لیے اس کے باپ نے اعلان کیا "اگر میری بات نہیں مانی تو پڑے رہو اسی طرح۔ کل سے تمہیں کھانا بھی صرف ایک وقت کا ملے گا" یہ کہتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

مابہ نے کسی کو ناراض کرنا کبھی نہیں سیکھا تھا۔ اس کو باپ کے اس طرح کمرے سے نکل جانے پر شدید دکھ ہوا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ سچائی کی تلاش میں مشکلات تو آنی ہی تھیں۔ یہ سوچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ اس حیرت میں مبتلا تھا کہ نہ جانے قسمت کب اس کا ساتھ دے گی اور وہ نئے مذہب کے بارے میں جاننے کے لیے شام جائے گا۔ انہیں سوچوں میں اس نے کروٹ لی۔ اس کی نظر سرہانے کے پاس پڑی عبا پر پڑی جو اس کا باپ غصے کی حالت میں یہیں بھول گیا تھا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اندر والی جیب میں اسے وہ چیز مل گئی جس کی اسے تلاش تھی اور وہ تھی اس کی بیڑیوں کی چابی۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو ان زنجیروں کی قید سے آزاد کیا اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ رات کے اس پہر گھر تو کیا پورا شہر سو رہا ہو گا۔ اس نے چند کپڑے ایک گٹھڑی میں باندھے اور خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا رہا۔ اس کی پہلی منزل گرجا گھر تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ پادری ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اور جب وہ گرجا گھر میں پادری کے کمرے میں پہنچا تو اس نے حیرت سے پوچھا

"مابہ! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے" مابہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں بیٹا۔ اگر تمہارا مقصد نیک ہے تو خدا خود تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن بات کیا ہے؟" پادری نے دریافت کیا۔

"آپ نے مجھے ملک شام کے بارے میں بتایا تھا" مابہ نے کہا "مجھے وہاں جانا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تاجروں کا ایک قافلہ بھی وہاں سے آیا ہوا ہے"۔

"ٹھیک ہے، تم جیسا چاہو گے ویسا ہی ہو گا" پادری بولا

تاجروں کا قافلہ شام جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اسے اپنی منزل پر روانہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن اصفہان کے ایک امیر اور بااثر شخص کی درخواست پر وہ کچھ دیر کے لیے رک گئے تھے۔ اس بااثر شخص کے آدمی اس وقت قافلے کی تلاشی لے رہے تھے۔ انہیں کسی سامان وغیرہ کی تلاش نہیں تھی بلکہ وہ اس شخص کے بیٹے کو ڈھونڈ رہے تھے جو اپنی بیڑیاں کھول کر باپ کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ شخص کوئی اور نہیں مابہ کا والد ہی تھا۔ مابہ کے والد کو خدشہ تھا کہ اس کے بیٹے نے عیسائیت سے متاثر ہو کر ملک شام کا ارادہ نہ کر لیا ہو۔ اسی لیے قافلے کو روک کر تلاشی لی جا رہی تھی۔ آدمیوں نے قافلے کا ایک ایک حصہ اور ایک ایک جگہ چھان ماری لیکن لڑکے کا نشان کہیں نہ ملا۔ آخر کار کر قافلے کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اصفہان شہر کی حدود سے تھوڑے فاصلے پر ایک گھوڑا گرد اڑاتا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ گھوڑے پر ایک کے بجائے دو آدمی سوار تھے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اور دوسرا نوجوان۔ دونوں تھوڑا فاصلہ اور طے کر کے تاجروں کے ایک قافلے سے جا ملے۔ یہ وہی قافلہ تھا جس کی ابھی کچھ دیر قبل شہر کے اندر تلاشی لی گئی تھی۔ گھڑ سواروں کو دیکھ کر تاجروں کے سردار نے ہاتھ کے اشارے سے قافلے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ بلند آواز میں بولا: "آ گئے پادری صاحب؟"

دونوں سوار بھی گھوڑے سے نیچے اتر آئے تھے۔ ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر سردار سے مصافحہ کیا۔

"یہی ہے وہ پرجوش نوجوان، جس کے بارے میں میں نے بات کی تھی" پادری نے کہا۔

"ہوں!" سردار نے سر سے پاؤں تک مابہ کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے پادری صاحب، ہم اسے لے چلتے ہیں۔ آپ

بالکل فکر نہ کریں۔ ہم اسے بحفاظت شام پہنچادیں گے۔ آگے یہ اپنی مرضی کا مالک خود ہو گا"۔

ماہہ نے پادری کا شکریہ ادا کیا اور قافلے میں شامل ہو گیا۔

شام پہنچ کر اس نے کسی ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جو اسے عیسائیت کے بارے میں تفصیل سے بتائے۔ پوچھتے پچھاتے ماہہ ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جسے لوگ بشپ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نے بشپ کو اپنی ساری روداد سنائی اور اسے اصفہان کے پادری کا حوالہ بھی دیا۔ وہ شخص اسے اپنے پاس رکھنے اور مذہب کے بارے میں تعلیم دینے پر راضی ہو گیا۔ ماہہ کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ بشپ عیسائیوں کے مذہب میں ان کا رہنما ہے۔ اب ماہہ نے آتش پرستی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر باقاعدہ عیسائیت کو اپنا لیا۔

ماہہ سمجھتا تھا کہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی نعمت پالی ہے۔ لیکن ایک دن اس نے ایسا منظر دیکھا کہ جس نے اس کے دل کو غم سے بھر دیا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ اللہ کی راہ میں خیرات کرنے کے لیے بشپ کو نذرانے میں سونا چاندی اور بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ ماہہ یہی سمجھتا تھا کہ نذرانے غریبوں اور بے کسوں کی مدد اور اللہ کے دین کو پھیلانے کے لیے خرچ کیے جاتے ہیں لیکن اس دن اس نے خود اپنی آنکھوں سے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔

اس دن وہ بشپ سے کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے اس کے خاص کمرے میں جا پہنچا تھا۔ وہ بشپ کا اہم شاگرد تھا اور اسے اس کمرے میں آنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ماہہ نے دیکھا کہ بشپ کے سامنے ایک مٹکا پڑا ہے جو سونے چاندی کے سکوں اور زیورات سے بھرا ہے۔ ماہہ نے یہ دیکھا تو الٹے قدموں واپس پلٹ آیا۔ بشپ کے ذاتی کمرے میں زیورات کے اس مٹکے کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ ان نذرانوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بجائے خود اپنے لیے رکھ لیتا ہے۔

وہ بشپ سے بہت محبت کرتا تھا لیکن اس کا یہ روپ دیکھ کر اسے بہت صدمہ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لوگ بشپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ ماہہ کی کسی اور شخص کے ساتھ زیادہ دوستی بھی نہ تھی کہ اسے اس اہم راز میں شریک کر سکے۔ ماہہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ بددیانتی اور فریب سے تو اسے شروع ہی سے نفرت تھی۔ سچ سے محبت ہی نے تو اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور اب جب اسے یہ معلوم ہوا کہ جس شخص پر اسے اس قدر اعتماد تھا وہی بددیانت ہے تو اسے سخت دکھ پہنچا۔ لیکن اس نے اپنے دل کو سمجھایا کہ کسی شخص کی ذاتی برائی کی وجہ سے اسے اپنا مذہب نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ماہہ اسی الجھن میں تھا کہ بشپ اچانک بیمار پڑ گیا اور جلد ہی فوت ہو گیا۔ بشپ کی آخری رسومات میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ نہ صرف پورا شہر بلکہ دور دراز کی بستیوں سے بھی عقیدت مند آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ماہہ نے سوچا کہ یہ شخص تو ساری زندگی ان سیدھے سادے لوگوں کو لوٹتا رہا۔ یہ ان مخلص لوگوں کی محبت کا ہرگز حق دار نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج وہ چپ نہیں رہے گا۔ آج وہ ان لوگوں کو بشپ کی حقیقت سے ضرور آگاہ کرے گا۔ بشپ کی لاش تدفین کے لیے رکھی جا چکی تھی۔ سب لوگ دعائیں پڑھنے میں مصروف تھے۔ ماہہ چپکے سے گرجا گھر کے اندر گیا اور کچھ چیزیں ایک بگھی پر لاد کر واپس قبرستان پہنچ گیا۔ دعا ختم ہو چکی تھی۔ تب ماہہ نے بلند آواز میں اعلان کیا۔

"ساتھیو! آج میں آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں"۔

"وہ کیا؟" مجمع میں سے آوازیں آئیں۔

"آج میں آپ لوگوں کو بشپ کی اصلیت سے آگاہ کرنے والا ہوں"۔

"ہمیں معلوم ہے' وہ نہایت نیک اور پرہیز گار انسان تھا" مجمع کی طرف سے جواب آیا۔

"یہی تو آپ کی بھول ہے" ماہہ بولا "آپ لوگ جس شخص کو نیک اور پرہیز گار سمجھتے رہے وہ اصل میں نہایت جھوٹا اور مکار شخص تھا"۔

"ارے' یہ نوجوان کیسی باتیں کر رہا ہے.... اسے کیا ہو گیا' دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے" لوگ غصے سے ماہہ کے خلاف بولنے لگے (باقی آئندہ)

مقدر کی پہیلیاں

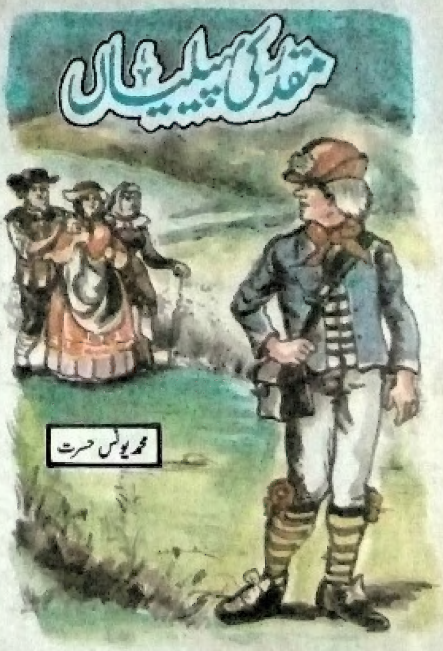

محمد یونس حسرت

بہار کے موسم کی ایک سہانی صبح تھی۔ والڈو بڑے مزے سے سویا ہوا خواب میں پریوں کے دیس کی سیر کر رہا تھا کہ اس کے والد نے اسے جھنجوڑ کر جگاتے ہوئے کہا "ارے والڈو! تم اب تک سوئے پڑے ہو۔ اٹھو' دیکھو' کتنا دن نکل آیا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی والڈو کو اپنی ماں کی آواز سنائی دی "اٹھو والڈو! تمہارا سب سے بڑا بھائی تو کبھی کا اپنی گائیں لے کر باہر جا چکا ہے"۔

اور اس کے ساتھ ہی والڈو کے کان میں اپنی دادی اماں کی آواز پڑی "اور تمہارا دوسرا بھائی بھی اپنی بھیڑیں لے کر باہر جا چکا ہے"۔

ان تینوں کی آوازیں سن کر والڈو اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس کے والد نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تم نے بہت آرام کر لیا بیٹا! اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنا مقدر تلاش کرنے کے لیے کسی طرف کا سفر کرو"۔

"لیکن میں تو یہیں خوش ہوں!" والڈو نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ کہا "آپ مجھے سفر کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا میں اپنے بڑے بھائیوں کی طرح گھر میں نہیں رہ سکتا؟"

"کیوں نہیں!" والد نے کہا "لیکن تم نے گھر میں جتنا عرصہ رہنا تھا رہ چکے' اب تمہیں اپنا مقدر تلاش کرنے کے لیے سفر کرنا ہے۔ کیونکہ تم تیسرے بیٹے ہو اور ہماری روایت یہی ہے کہ تیسرے بیٹے مقدر تلاش کرنے کے لیے سفر کرتے ہیں"۔

"مگر میں یہاں رہ کر بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہوں" والڈو نے کہا "میرے بھائی گائیں اور بھیڑیں پالتے ہیں' میں بکریاں پال سکتا ہوں' مرغیاں پال سکتا ہوں' شہد کی مکھیاں پال سکتا ہوں۔ ہزاروں کام ہیں جو میں یہاں رہ کر کر سکتا ہوں"۔

"نہیں میرے بیٹے!" والد نے کہا "تیسرے بیٹے کو مقدر تلاش کرنے کے لیے سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ بزرگوں کے وقت سے ہماری یہی روایت چلی آرہی ہے۔ تمہیں سفر کرنا ہی پڑے گا اور پھر اپنے آپ کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لیے خود ہی کوئی ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا"۔

"جیسے کوئی خوب صورت محل" ماں نے جیسے بات پوری کرتے ہوئے کہا "یا کوئی عالی شان حویلی!"

"اور اس میں تم اپنے لیے کوئی شہزادی بیاہ کر لاؤ گے" دادی اماں نے بات آگے بڑھائی "یا وہاں اپنے لیے پریوں کے دیس سے کوئی دلہن لاؤ گے جو تمہاری زندگی کی تنہائیوں کی ساتھی ہوگی"۔

"اور ہاں!" والد نے اپنی جیب سے کچھ سکے نکال کر انہیں کھنکھناتے ہوئے کہا "تمہیں سونے یا چاندی کے قیمتی

سکے بھی کہیں نہ کہیں سے حاصل کرنے ہوں گے تاکہ تمہاری جیب میں کچھ مال ہو اور لوگ تمہیں فقیروں کی طرح ہاتھ خالی جیب خالی ہونے کا طعنہ نہ دیں۔ بس اب تمہیں جلدی سے تیار ہو کر اپنے سفر پر چل دینا چاہیے"۔

"اور میں تمہیں" ماں نے کہا "سفر میں کھانے کے لیے ایک روٹی دیے دیتی ہوں' آگے تم جانو اور تمہارا کام"۔

"اور میں!" دادی اماں نے کہا "تمہیں چار پہیلیاں دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پہیلیاں سفر میں تمہارے بہت کام آئیں گی"۔

چنانچہ اپنے والد کی دی ہوئی ہدایات' ماں کی دی ہوئی روٹی اور دادی اماں کی دی ہوئی پہیلیاں لے کر والڈو اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

گھر سے نکل کر وہ چند قدم چلا اور پھر مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ اپنے ماں باپ کے گھر سے دور جاتے ہوئے اس کا جی اداس ہو رہا تھا۔ اس نے پہلی پہاڑی کی طرف نگاہ کی جہاں اس کا بڑا بھائی گائیں چرا رہا تھا۔ اس نے دوسری پہاڑی کی طرف نظر ڈالی جہاں اس کا دوسرا بھائی بھیڑیں چرا رہا تھا۔ اس نے تیسری پہاڑی کی طرف دیکھا جہاں کچھ نہ کچھ چرانا اس کی دلی خواہش تھی۔ والڈو ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ اپنے ماں باپ کا تیسرا بیٹا تھا اور بزرگوں کے وقت سے تیسرے بیٹے کے لیے یہی ضروری تھا کہ وہ مقدر تلاش کرنے کے لیے سفر کرے۔

سارا دن والڈو چلتا رہا۔ شام کے قریب وہ ایک چوراہے پر پہنچا تو اس کے قدم جیسے اپنے آپ رک گئے۔ اسے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آگے کس راستے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے راستے کے بارے میں کسی سے پوچھنے کے ارادے سے اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو اسے ایک درخت کے نیچے پہلوانوں جیسے ڈیل ڈول کا ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ اس پہلوان نے اپنے بائیں ہاتھ میں ایک خاصا بھاری پتھر اٹھایا ہوا تھا اور اس نے دائیں ہاتھ میں ایک سیب تھا۔ اس نے والڈو کو دیکھا تو کہنے لگا "ارے لڑکے! کدھر جا رہے ہو؟"

"میں مقدر تلاش کرنے نکلا ہوں" والڈو نے بڑے ادب سے جواب دیا "اور یہ آپ نے اتنا بھاری پتھر کیوں اٹھا رکھا ہے؟"

"یہ تو میں ورزش کر رہا ہوں۔ لڑکے! تمہارا مقدر تمہارے اپنے مضبوط بازوؤں اور مضبوط کمر میں ہے۔ تم بھی ذرا ایک دو پتھر اٹھا کر ورزش کر کے دیکھو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں"۔

"آؤ ہم بانٹ کر کھانا کھاتے ہیں" پہلوان نے کہا۔ چنانچہ والڈو نے اپنی روٹی کا ایک حصہ پہلوان کو دے دیا اور پہلوان نے آدھا سیب والڈو کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ بہت طاقت ور معلوم ہوتے ہیں"۔

"ہاں!" پہلوان نے ذرا گردن اکڑاتے ہوئے کہا "مجھ سے زیادہ طاقت ور انسان تمہیں ساری دنیا میں نظر نہیں آئے گا۔ تمہیں یقین نہ آئے تو میں تمہارے ساتھ شرط لگانے کو تیار ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے پہلوان نے اپنی جیب سے سونے کا ایک سکہ نکالا اور اسے ہوا میں اچھال کر دوبارہ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہنے لگا "یہ پتھر تو میرے لیے ایک کنکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں تو پہاڑ کا پہاڑ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہوں۔ تم ایسی کسی چیز کا نام تو لے کر دکھاؤ جسے میں تھام نہ سکوں"۔

"میرے پاس شرط لگانے کے لیے کچھ نہیں ہے" والڈو نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" پہلوان نے کہا "اگر تم جیت گئے تو یہ سکہ تمہارا ہو جائے گا۔ اگر میں جیت گیا تو تمہاری باقی روٹی میری ہو جائے گی"۔

"اچھا" والڈو نے کہا "تو پھر سنیے جناب!"

یہ کہہ کر والڈو نے دادی اماں کی دی ہوئی پہلی پہیلی سنا دی۔

"کیا چیز ہے جو پنکھ سے بھی زیادہ ہلکی اور پھول سے

بھی زیادہ نازک ہے مگر دنیا کا طاقت ور سے طاقت ور انسان بھی اسے چند منٹ کے لیے نہیں تھام سکتا"۔

"مجھے پہیلیاں نہیں آتیں لڑکے" صاف صاف بتاؤ وہ کیا چیز ہے جسے میں چند منٹ کے لیے بھی تھام نہیں سکتا"۔

"وہ چیز آپ کا سانس ہے جناب" والڈو نے کہا "جسے دنیا کا طاقت ور سے طاقت ور انسان بھی چند منٹ کے لیے نہیں روک سکتا"۔

پہلوان نے شرط کے مطابق سونے کا سکہ والڈو کے حوالے کر دیا اور والڈو اسے جیب میں ڈال کر وہیں درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی اور نیند میں وہ پھر پریوں کے دیس کی سیر کرنے لگا۔

اگلی صبح والڈو پھر اپنے سفر پر روانہ ہوا اور دائیں طرف کے راستے پر ہو لیا۔ دن بھر سفر کرتے کرتے وہ شام کے وقت ایک اور چوراہے پر جا پہنچا۔ اس چوراہے کے قریب ایک ندی تھی اور اس ندی کے کنارے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پنیر کا ایک ٹکڑا تھام رکھا تھا اور اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھتری تھی۔ اس آدمی کی عمر تو چالیس پچاس سال معلوم ہوتی تھی مگر وہ چار پانچ سال کے بچے کی طرح رو رہا تھا۔ والڈو کو دیکھ کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور کہنے لگا "ارے لڑکے! کہاں جا رہے ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم اپنے گھر سے بہت دور نکل آئے ہو"۔

"جی ہاں" والڈو نے بڑے ادب سے کہا "میں مقدر تلاش کرنے نکلا ہوں۔ لیکن یہ آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

"میں اس لیے رو رہا ہوں کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں" چھتری والے آدمی نے کہا "ماں نہ باپ، بہن نہ بھائی، بیوی نہ بچے، میں روؤں نہ تو اور کیا کروں۔ تمہارا خاندان تمہارا مقدر ہے لڑکے۔ اور تمہارا مقدر ہی تمہارا خاندان ہے"۔

والڈو تھکا ہوا بھی تھا اور اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ وہیں زمین پر چھتری والے شخص کے پاس بیٹھ گیا اور رومال کھول کر روٹی نکالی۔ اس شخص نے کہا "آؤ بانٹ کر کھانا کھاتے ہیں"۔

چنانچہ والڈو نے اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیا اور اس شخص نے والڈو کو کچھ پنیر دے دیا۔

جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو والڈو نے کہا "جناب! مجھے پہیلیوں کا بڑا شوق ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں ایک پہیلی کہتا ہوں۔ اگر آپ اسے بوجھ لیں تو میری روٹی آپ کی ہو جائے گی اور اگر آپ اسے نہ بوجھ سکیں تو آپ اس کا جواب مجھے دیں گے"۔

"یہ کیا بات ہوئی لڑکے!" چھتری والے شخص نے کہا "اگر میں تمہیں اس کا جواب دے دیتا ہوں تو پھر تو میں جیت جاؤں گا"۔

"نہیں جناب!" والڈو نے کہا "اگر آپ مجھے اس کا جواب دیں گے تو جیت میری ہو گی، آپ کی نہیں"۔

"بڑی عجیب بات ہے" چھتری والے شخص نے کہا۔

"جتنی عجیب ہی سہی" والدو نے کہا۔ "خیر' اب پہیلی بوجھیے"۔

"وہ کیا چیز ہے جو مکان کی چھت کا کام تو دیتی ہے مگر مکان کی طرح اس کی دیواریں نہیں ہوتیں"۔

پہیلی سن کر چھتری والے شخص نے سوچا' سوچا' بہت سوچا۔ آخر اس نے کہا "بھئی میں ہارا اور تم جیتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی چیز ہے جو مکان کی چھت کا کام تو دیتی ہے مگر مکان کی طرح اس کی دیواریں نہیں ہوتیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس پہیلی کا جواب کیسے دے سکتا ہوں؟"

"پھر تو میں جیت گیا" والدو نے ہنستے ہوئے کہا "اس پہیلی کا جواب چھتری ہے اور اب آپ کو یہ جواب یعنی چھتری مجھے دینی چاہیے"۔

اس شخص نے چھتری والدو کے حوالے کر دی۔ والدو نے چھتری اپنے سرہانے زمین پر رکھی اور وہیں لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی' لیٹتے ہی اسے نیند آگئی اور نیند میں پھر پریوں کے دیس کی سیر کرنے لگا۔

اگلی صبح والدو پھر اپنے سفر پر روانہ ہوا اور پہلے کی طرح اب کے بھی دائیں طرف کے راستے پر ہو لیا۔ دن بھر سفر کرتے کرتے وہ شام کے قریب ایک اور چوراہے پر جا پہنچا۔ وہاں ایک نوجوان ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' ایک ہاتھ میں انگوروں کا ایک گچھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ بڑے غور سے اور بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا تھا۔ والدو کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور والدو کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر حیرانی سے کہا "ارے لڑکے! تم کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اپنے گھر سے آرہا ہوں" والدو نے کہا۔ "اور اپنا مقدر تلاش کرنے نکلا ہوں"۔

"میں نے بہت سی شکلیں دیکھی ہیں" نوجوان نے کہا "میں بھی اپنا مقدر تلاش کرنے کے لیے جگہ جگہ پھرا ہوں لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ انسان کا مقدر اس کے سر میں ہوتا ہے"۔

"سر میں!" والدو نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں' انسان کے سر میں" نوجوان بولا "یعنی انسان کا دماغ ہی اس کا مقدر ہوتا ہے"۔

"اچھا!" والدو نے کہا "اور یہ آپ پڑھ کیا رہے ہیں؟"

"یہ ایک لغت ہے" نوجوان نے کہا "یہ لفظوں سے بھری ہوئی کتاب ہے مگر اس میں بے مطلب کی بات کوئی نہیں۔ یہ معلومات سے پر ہے لیکن الٹی سیدھی باتوں سے خالی ہے"۔

"بہت خوب!" یہ کہتے ہوئے والدو اس نوجوان کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ دن بھر کے سفر سے وہ تھکا ہوا بھی تھا اور اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے زمین پر بیٹھ کر رومال میں بندھی ہوئی روٹی نکالی۔ اس پر نوجوان نے کہا۔

"آؤ ہم بانٹ کر کھانا کھاتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نوجوان نے انگوروں کا آدھا گچھا والدو کو دے دیا اور والدو نے اپنی روٹی کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو والدو نے کہا۔

"جناب مجھے پہیلیوں کا بڑا شوق ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں ایک پہیلی کہتا ہوں۔ اگر آپ اسے بوجھ لیں تو میری روٹی آپ کی ہو جائے گی اور اگر آپ اسے نہ بوجھ سکیں تو آپ اس کا جواب مجھے دیں گے"۔

"یہ کیا بات ہوئی لڑکے!" نوجوان نے کہا "اگر میں تمہیں اس کا جواب دے دیتا ہوں تو پھر تو میں جیت جاؤں گا"۔

"نہیں جناب!" والدو نے کہا "اگر آپ اس کا جواب مجھے دیں گے تو جیت میری ہوگی آپ کی نہیں"۔

"بڑی عجیب بات ہے" نوجوان نے کہا۔

"چلئے عجیب ہی سہی؟" والقدو نے کہا۔ "تو اب پہیلی بتائیے۔" "وہ کون سی جگہ ہے جہاں بدھ منگل سے پہلے آتا ہے"۔

پہیلی سن کر نوجوان نے سوچا، سوچا، بہت سوچا آخر اس نے کہا۔ "شرط میں ہارا اور تم جیتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں بدھ منگل سے پہلے آتا ہے۔ میں نے ہر جگہ یہی دیکھا ہے اور یہی سنا ہے کہ بدھ منگل کے بعد آتا ہے، پہلے نہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس پہیلی کا جواب کیسے دے سکتا ہوں"۔

"پھر تو میں جیت گیا" والقدو نے ہنستے ہوئے کہا "اس پہیلی کا جواب یہ ہے کہ لغت میں۔ یعنی لغت میں بدھ منگل سے پہلے آتا ہے۔ اب آپ کو یہ جواب یعنی لغت مجھے دینی ہوگی"۔

نوجوان نے لغت والقدو کے حوالے کر دی۔ والقدو نے چھتری کے ساتھ ساتھ لغت بھی اپنے سرہانے رکھی اور وہیں لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی لیٹتے ہی اسے نیند آگئی اور نیند میں وہ چھتریوں کے دیس کی سیر کرنے لگا۔

اگلی صبح والقدو پھر اپنے سفر پر روانہ ہوا اور پہلے کی طرح اب کے بھی وہ دائیں طرف کے راستے پر ہو لیا۔ دن بھر سفر کرتے کرتے وہ شام کے قریب ایک اور چوراہے پر جا پہنچا۔ وہاں ایک بڑھیا پتھروں سے بنائے ہوئے ایک چولہے پر ہنڈیا رکھے اس میں بار بار ڈوئی چلا رہی تھی۔ والقدو کے قدموں کی آہٹ سن کر بڑھیا نے نظریں اٹھائیں اور والقدو کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر حیرانی کے ساتھ کہا۔

"ارے لڑکے! تم کہاں سے آرہے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟"

"میں اپنے گھر سے آرہا ہوں" والقدو نے کہا اور "مقدر تلاش کرنے نکلا ہوں"۔

"یہ مقدر تلاش کرنے کا کام تو سخت تھکا دینے اور اکتا دینے والا ہے" لڑکے!"

"ہاں، میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں" والقدو نے کہا۔ پھر وہ بڑھیا کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ دن بھر کے سفر سے وہ تھکا ہوا بھی تھا اور اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے زمین پر بیٹھ کر رومال میں بندھی ہوئی روٹی نکالی۔ اس پر بڑھیا نے کہا۔

"آؤ ہم بانٹ کر کھانا کھاتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے بڑھیا نے والقدو کو ہنڈیا میں سے کچھ شوربا دیا اور والقدو نے اپنی بچی ہوئی روٹی کے دو حصے کر کے ایک حصہ بڑھیا کو دے دیا اور دوسرا حصہ خود کھانے لگا۔

جب وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تو واللہ دو نے کہا۔ "بی اماں! مجھے پہیلیوں کا بڑا شوق ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں ایک پہیلی کہتا ہوں۔ اگر آپ اسے بوجھ لیں تو میں کل آپ کی ہنڈیا اٹھا کر آپ جہاں حکم کریں گے وہاں لے چلوں گا۔ اور اگر آپ اسے نہ بوجھ سکیں تو پھر آپ کو میرے مقدر کے بارے میں بتانا ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ میں تو اس کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا ہوں"۔

"اچھی بات ہے" بڑھیا بولی "تم اپنی پہیلی کہو"۔

واللہ دو نے کہا "وہ کیا چیز ہے جو ادھر سے ادھر یہاں سے وہاں ہر جگہ اور ہر طرف جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی"۔

پہیلی سن کر بڑھیا نے سوچا' سوچا' بہت سوچا۔ آخر وہ کہنے لگی۔ "ارے لڑکے! میں ہاری اور تم جیتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے جو ادھر سے ادھر' یہاں سے وہاں ہر جگہ اور ہر طرف جاتی ہے اور اس کے باوجود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی۔ تم ہی بتاؤ وہ کیا چیز ہے؟"

"وہ چیز سڑک ہے بی اماں' سڑک!" واللہ دو نے ہنستے ہوئے کہا "سڑکیں ہر طرف جاتی ہیں لیکن اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتیں۔ اب آپ کی باری ہے۔ مجھے بتایئے کہ میرا مقدر مجھے کہاں ملے گا؟"

"بتاتی ہوں" بڑھیا نے کہا "اور ابھی بتاتی ہوں۔ ویسے یہ بھی ایک پہیلی ہی ہے۔ لو سنو!

"وہ کیا چیز ہے جو تمہاری اپنی ہی ہے۔ اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ وہ ہمیشہ تمہارے آگے ہوتی ہے مگر تم اسے دیکھ نہیں سکتے"۔

واللہ دو نے سوچا' سوچا' بہت سوچا اور پھر سوچتے سوچتے ہی زمین پر لیٹ گیا۔ دن بھر کے سفر سے تھکا ہارا ہونے کے باوجود پہلے کی طرح اسے نیند نہیں آئی اور وہ نیند میں پریوں کے دیس کی سیر کرنے کے بجائے یہی سوچتا رہا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو ہمیشہ ہمارے آگے ہوتی ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ صبح ہوئی تو اس نے بڑھیا سے کہا۔

"میں ہارا اور آپ جیتیں بی اماں! اب خدا کے لیے مجھے بتائیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو میری ہے مگر میں اس سے بھاگ نہیں سکتا اور ہمیشہ میرے آگے ہوتی ہے مگر میں اسے دیکھ نہیں سکتا"۔

"وہ چیز تمہارا مستقبل ہے" بڑھیا نے ہنستے ہوئے کہا "اور تمہارا مستقبل تمہارے آگے ہے۔ اٹھو اور بائیں طرف کے راستے پر چلتے جاؤ"۔

واللہ دو نے ایک نظر دو راستے کی طرف ڈالی اور پھر کہا۔

"مگر دائیں طرف کا راستہ زیادہ سرسبز اور رونق والا نظر آتا ہے جبکہ بائیں طرف کا راستہ اجاڑ لگتا ہے"۔

"اپنے اپنے خیال کی بات ہے" بڑھیا نے کہا۔ "مشکل راستے پر بھی اگر چلو اور چلتے جاؤ تو تمہارا مقدر تمہیں مل جائے گا"۔

چنانچہ بڑھیا کے کہنے کے مطابق واللہ دو بائیں طرف کے راستے پر ہو لیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جیسے جیسے وہ آگے قدم بڑھاتا جاتا تھا' راستہ جیسے ہموار ہوتا جاتا تھا اور اس کے اردگرد کے کھیت جو پہلے خشک اور ویران نظر آتے تھے' اپنے آپ سرسبز ہوتے جاتے ہیں۔ دور اسے تین پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے ساتھ ایک گھر تھا اور اس گھر کے دروازے پر ایک بڑھیا کھڑی تھی۔

"دادی اماں؟" واللہ دو اسے دیکھ کر پکارا "میں واپس آگیا ہوں"۔

"واللہ دو!" دادی اماں نے چلا کر کہا "اچھا ہوا تم آگئے۔ میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہی تھی"۔

واللہ دو کی ماں بھی گھر کے اندر سے دوڑی دوڑی آئی اور واللہ دو کا والد بھی مویشیوں کے باڑے میں اپنے کام کو چھوڑ کر بھاگا بھاگا وہاں آیا اور وہ دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔ "کیا تمہیں اپنا مقدر مل گیا ہے واللہ دو؟"

واللہ دو ان کی بات سن کر ہنس دیا۔ اس کے والد نے

نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "تم ہنس کیوں رہے ہو والدو؟ کیا تمھیں اپنا مقدر مل گیا ہے؟"

"پتا نہیں" والدو نے جواب دیا "پہلوان کہہ رہا تھا کہ میرا مقدر میرے مضبوط بازوؤں اور مضبوط کمر میں ہے۔ کتاب پڑھنے والے نوجوان کا کہنا تھا کہ میرا مقدر میرے سر میں یعنی میرے دماغ میں ہے۔ چھتری والا شخص کہہ رہا تھا کہ میرا مقدر میرے خاندان میں ہے اور وہ بڑھیا کہہ رہی تھی کہ میرا مقدر میرے مستقبل میں ہے۔ سو میں واپس اپنے خاندان میں چلا آیا ہوں تاکہ اپنے دماغ اور اپنے مضبوط بازوؤں اور مضبوط کمر کے ساتھ اپنا مقدر بنا سکوں"۔

"لیکن تمھارا محل کہاں ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"اور تمھاری خوب صورت دلہن کہاں ہے؟" دادی اماں نے پوچھا۔

"اور تمھارا سونا چاندی؟" والد نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

والدو نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

"آپ نے مجھے دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنے لیے تنہائیوں کا ساتھی تلاش کرنے کی ہدایت کی تھی اور اپنی جیب میں ڈالنے کے لیے سونے چاندی کے قیمتی سکے حاصل کرنے کو کہا تھا"۔

"ہاں ہاں!" والد نے کہا "کہا تو تھا مگر یہ سب چیز کہاں ہے؟"

"یہ میرے لیے دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا سامان ہے" یہ کہتے ہوئے والدو نے چھتری کھول کر دکھائی۔

"یہ میری تنہائیوں کی ساتھی ہے" یہ کہتے ہوئے والدو نے اپنے تھیلے میں سے لغت کی کتاب نکال کر دکھائی۔

"اور یہ میری جیب میں ڈالنے کے لیے مال ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے سونے کا سکہ نکال کر دکھایا۔

"اس سے میں یا تو بکریاں خریدوں گا یا مرغیاں لے کر پالوں گا اور پھر اپنے بھائیوں کی طرح انھیں تیسری پہاڑی پر چرایا کروں گا"۔

"بکریاں یا مرغیاں؟" دادی اماں نے پوچھا۔

"شاید دونوں" والدو نے کہا "میں اپنے خاندان کے ساتھ رہوں گا اور اپنی بکریوں اور مرغیوں کو تیسری پہاڑی پر چراتے ہوئے دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے اپنی چھتری تان لیا کروں گا۔ میری لغت میری تنہائیوں کی ساتھی ہوگی اور میں اسے پڑھ پڑھ کر بہت کچھ سیکھ بھی جاؤں گا اور اس طرح ہم سب ہنسی خوشی ایک ساتھ ایک جگہ رہیں گے"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ والدو نے اپنے سونے کے سکے سے چند بکریاں اور مرغیاں خریدیں اور انھیں تیسری پہاڑی پر چرانے لگا۔ ہوتے ہوتے اس کے پاس درجنوں بکریاں اور بیسیوں مرغیاں ہو گئیں۔ اس طرح اسے اپنے خاندان ہی میں اپنا مقدر مل گیا اور وہ اپنے والد، ماں، دادی اماں اور دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزر بسر کرتا رہا

یونی ورسٹی کی سالانہ تقریب کے بعد جب کھانا شروع ہوا تو سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سمورا نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ سارے ساتھیوں نے زور دیا کہ کچھ تو کھاؤ لیکن سمورا انکار ہی کرتا رہا۔ بس وہ یہی جواب دیتا کہ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔

تقریب ختم ہوئی تو سمورا ہوسٹل پہنچا۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ سمورا نے جو کبھی کھانے سے ہاتھ کھینچنے پر تیار نہ ہوتا تھا آج کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس کے ہوسٹل کے سارے ساتھی اس قدر حیران ہوئے کہ انہوں نے اس کو سال کی سب سے اہم خبر قرار دے دیا۔ ایک ساتھی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سمورا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی لیکن سارے لڑکے اس کے پیچھے پڑ گئے "یار، عجیب بات کرتے ہو تم بھی۔ طبیعت ٹھیک نہ ہوتی تو وہ وہاں جاتا ہی کیوں؟ دوسری بات یہ کہ سمورا نے طبیعت خراب ہونے کے باوجود کیا آج تک کبھی کھانا چھوڑا ہے؟"

یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ سمورا تو اپنی طبیعت کی خرابی کا علاج ہی کھانے سے کرتا تھا۔ دو سال پہلے تو اسے یونی ورسٹی کے سب سے پرخور یعنی سب سے زیادہ کھانے والے کا خطاب مل چکا تھا۔ ہوسٹل کے ساتھی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے تاکہ یہ معمہ حل ہو سکے۔ انہوں نے سمورا کو سامنے سے آتے دیکھا تو زبردست شور مچ گیا۔ سب نے مل کر بولنا شروع کیا۔

"یار تم نے تو ہوسٹل کی ناک کٹوا دی اور اپنا ریکارڈ بھی تباہ کر لیا" "واہ جی واہ۔ جسے عظیم پرخور کا خطاب مل چکا ہو وہ ایک نوالہ نہ کھا سکے۔ آخر بتاؤ تو ہوا کیا؟"

سمورا مسکراتا رہا اور خاموش رہا لیکن جب دوستوں نے بہت زور ڈالا تو بولا۔

"بھائیو! تم دیکھ رہے ہو کہ مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ غریب کے لیے زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا اچھا لگتا ہے کہ ہم دعوتیں اڑائیں"۔

لڑکوں میں سے کسی نے آواز لگائی "لو بھائیو، یہ تو کیا کام ہے"۔

دوسری آواز آئی "ایک دم ہی دل میں غریبوں کا درد پیدا ہو گیا میرے بھائی، کہیں لیڈری کا چکر تو نہیں چلا رہے؟"

تیسرے لڑکے نے کہا "یار، ایک دن یا ایک وقت فاقہ کر کے کیا تیر مار لیا۔ بات تو جب ہے کہ غریبوں کی ہمدردی میں دو چار دن فاقے کرو۔ ہم بھی دیکھیں کتنی قربانی دے سکتے ہو"۔

مذاق کی یہ بات سمورا کے دل کو کچھ ایسی لگی کہ اس نے واقعی کھانا چھوڑ دیا۔ دوسرے دن سب لڑکے کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سمورا نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مگر وہ تھا بالکل ہشاش بشاش۔ خوب ہنس رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ مذاق کر رہا تھا اور مذاق کا جواب دے رہا تھا۔ لیکن کھانا نہیں کھا رہا تھا۔ اس کے حصے کا کھانا دوستوں نے کھا لیا اور ان میں سے ایک نے کہا "بھائی! کھانا نہ کھاؤ پر یہ تو بتا دو کہ روگ کیا ہے؟" دوسرا دوست بولا "روگووگ کوئی نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ رچا رہا

ہے، سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے۔"

تیسرے دوست نے قہقہ لگاتے ہوئے کہا "دنیا کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ کوئی بات نہیں دو دن بھی نہیں گزریں گے کہ دن میں تارے نظر آنے لگیں گے"۔

سمورا مسکراتا رہا اور پھر تھوڑی بعد بولا "دوستو! تم نے ہی کل طعنہ دیا تھا کہ غریبوں کے ہمدرد ہو تو دو چار دن فاقے کرو۔ بات دل میں بیٹھ گئی۔ اب دیکھو فاقے پر فاقے ہوں گے"۔

سمورا قول کا سچا نکلا اور اس نے واقعی فاقوں پر فاقے شروع کر دیے۔ وہ کھانے کے کمرے میں آتا لیکن کھانا نہ کھاتا۔ اسے کسی نے کہیں اور بھی کھاتے پیتے نہ دیکھا نہ اس کے کمرے میں کھانے پینے کی کوئی چیز پائی گئی۔ 24 گھنٹے کی کڑی نگرانی کے بعد جب اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ وہ سب کے سامنے کچھ کھاتا پیتا ہے نہ چھپ کر۔ اب ان کا مذاق پریشانی میں بدلنے لگا۔ ساتھ ہی یہ حیرانی بھی تھی کہ تیسرے دن بھی سمورا بالکل صحت مند اور ہشاش بشاش تھا۔

سمورا کے دوستوں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ کھانا پینا شروع کرے اور اپنی جان کا دشمن نہ بنے لیکن اس کے پاس دوستوں کی باتوں کا ایک ہی جواب تھا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ میں ڈرامہ رچا رہا ہوں۔ سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے طعنہ دیا تھا کہ دو چار دن فاقے کروں تب پتا چلے گا کہ میں غریبوں کا ہمدرد ہوں۔ تم سب یہی سمجھتے تھے کہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اب دیکھو کتنے دن فاقے کرتا ہوں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ اگر میں بھوک سے مر گیا تو میرا خون تمھاری گردن پر ہو گا"۔

"خواہ مخواہ ہماری گردن پر ہو گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ تمھاری موت خودکشی ہو گی" ایک دوست نے کہا۔ دوسرا بولا "یار میرا خیال ہے کہ اس فاقہ کشی میں بھی کوئی چکر ہے۔ ہمیں وارڈن کو بتانا چاہیے"۔

سمورا نے فاقوں کے باوجود ایک زوردار قہقہ لگایا اور کہنے لگا "ہاں تم تو یہی کہو گے۔ ارے فاقوں میں چکر نہیں ہے۔ چکر تو میری تقدیر کا ہے کہ تم جیسے دوست مل گئے جو ہمدردی کے بجائے فقرے کس رہے ہیں۔ طعنے دے رہے ہیں"۔

ایک دوست بولا "یار! کمال کی بات یہ ہے کہ تم فاقوں پر فاقے کر رہے ہو لیکن جسم میں طاقت اور توانائی ویسی کی ویسی ہے"۔

دوسرا دوست کہنے لگا

"بھائی کیا بات کر رہے ہو۔ اتنی کی اتنی کہاں۔ معلوم یہ ہوتا ہے اس میں دگنی توانائی آگئی ہے۔ ذرا دیکھو تو اس کے چہرے کی رونق اور پھر زور زور سے قہقہے بھی لگا رہا ہے۔ بھلا بتاؤ تین چار دن سے جس کے منہ میں ایک دانہ نہ گیا ہو وہ اس طرح ہشاش بشاش رہ سکتا ہے؟ بھائیو! سب متحد ہو جاؤ تاکہ سمورا کے فاقوں کا راز معلوم کیا جا سکے"۔

ایک اور دوست نے سمورا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں بھئی پتا تو چلے کہ یہ کیا ڈرامہ ہے۔ آخر اس کے جسم میں کتنی غذا ذخیرہ تھی جو ختم ہونے پر نہیں آتی"۔

سمورا سب کی باتیں سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ دوسرے دن صبح ایک ڈاکٹر اور اس کے ساتھ دو آدمی سمورا کے کمرے میں آئے اور پوری طرح اس کا طبی معائنہ کیا۔ یہ لوگ دو دن پہلے بھی آ چکے تھے۔ انہوں نے کسی سے کچھ بات نہ کی اور واپس چلے گئے۔ سمورا کے دوستوں نے ان سے بہت سوال کئے اور اس کی حالت معلوم کرنا چاہی لیکن ڈاکٹر بار بار یہی کہتا رہا "حالت پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سمورا کی صورت دیکھ کر اندازہ لگا لیں"۔

دوست سمورا کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک نے کہا "یارا ہاتھ جڑوا لو ہم سے۔ کان پکڑوا والو۔ ہم اپنی ساری باتیں واپس لیتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کچھ نہیں کہیں گے"۔

دوسرا بول پڑا "بھائی مذاق ہی مذاق میں کچھ ہو گیا تمہیں تو ہم سب کی کم بختی آجائے گی۔ بس ختم کرو اس ڈرامے کو"۔

"پھر ڈرامہ؟ ٹھیک ہے تم ڈرامہ سمجھے جاؤ۔ میں ہرگز فاقہ کشی ترک نہیں کروں گا۔ میرا یہ فاقہ غربت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ مجھے بزدل اور کمزور نہ سمجھو۔ میں فاقوں سے ڈرنے والا نہیں"۔

ایک دن اور گزر گیا۔ اور دوستوں کی آپس میں باتیں شروع ہو گئیں۔ ایک دوست کہنے لگا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سمورا ایک دم دنیا بھر کے غریبوں کا اتنا ہمدرد کیسے بن گیا"۔

دوسرے دوست نے کہا "مجھے تو اس بات پر تعجب ہے کہ اتنا پر خور اور پیٹو آدمی کس طرح اتنے دن تک بغیر کچھ کھائے پئے زندہ رہ سکتا ہے"۔

ایک اور دوست نے جو دو دن سے کسی گہری سوچ میں تھا گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "کچھ بھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ نہ کوئی چکر ہے اور نہ کوئی دھوکا۔ میرے خیال میں فاقوں سے اس شخص کی روحانی قوت میں اضافہ ہوا ہے اور یہی قوت اسے زندہ رکھے ہوئے ہے"۔

دوستوں میں سے کسی نے کہا "صرف فاقوں سے روحانی قوت نہیں بڑھ سکتی۔ یہ کہو کہ وہ ایک اچھے مقصد کے لیے کھانا پینا چھوڑے ہوئے ہے"۔

"ہاں ہاں یہی مطلب ہے میرا" پہلے والا لڑکا بولا۔

باقی دوستوں نے قہقہہ لگایا اور ان میں سے ایک بولا "چھوڑو یار کہاں کی باتیں لے بیٹھے۔ سمورا اور روحانی قوت! نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ روحانی قوت' ضرور کوئی چکر ہے اس میں"۔

اس وقت تو یہ بات ٹل گئی لیکن جب فاقے کا چھٹا دن آیا تو پورے ہوسٹل میں یہ بات پھیل گئی کہ سمورا اپنی روحانی قوت کے سہارے زندہ ہے۔ کچھ لڑکوں نے اس سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے مسئلوں کے بارے میں مشورہ کرنا شروع کر دیا اور کچھ اس سے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں معلوم کرنے لگے۔ سمورا نے لاکھ ٹالنا چاہا لیکن ہر وقت اس کے گرد لڑکے جمع رہتے اور اس سے طرح طرح کے سوال کرتے رہتے۔

فاقے کا ساتواں دن آیا تو سمورا کی روحانی قوت والی بات ہوسٹل سے نکل کر ساری یونی ورسٹی میں پھیل چکی تھی اور سمورا کے ہوسٹل میں طالب علموں کا ہجوم تھا۔ طالب علم ہاتھوں میں گل دستے لیے اور نیک خواہشات کے کارڈ تھامے ہوئے چلے آرہے تھے۔ بڑی مشکل سے سمورا نے ان سے پیچھا چھڑایا اور وعدہ کیا کہ کل وہ ان کے سب

سوالوں کا جواب دے گا۔

دوسرے دن دوپہر تک کافی لوگ سمورا کے کمرے کے پاس جمع ہو چکے تھے اور یہ انتظار کر رہے تھے کہ وہ باہر آئے۔ جب دیر ہوئی تو انھوں نے سمورا کو آوازیں دینا شروع کیں اور دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا تو انھوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ دروازے کا تالا بند ہے۔

چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ہر ایک زبان پر یہی جملہ تھا "سمورا مر گیا"۔ البتہ ہر ایک کو یہ حیرانی ضرور تھی کہ سمورا کل تک تو بالکل تندرست و توانا تھا۔ رات بھر میں اسے اچانک یہ کیا ہو گیا۔ کسی نے کہا "نہ جانے اسے سوجھی کیا تھی جو ایکا ایکی فاقے کرنے کی ٹھان لی۔ بے چارے کو کسی نے سمجھایا بھی نہیں"۔

"سمجھایا کیوں نہیں۔ دوستوں نے تو ہاتھ تک جوڑ لیے کہ بھائی باز آجاؤ لیکن وہ دھن کا پکا تھا" ایک اور شخص بولا۔

کسی اور نے اپنی رائے ظاہر کی "دراصل لوگ مذاق سمجھ رہے تھے لیکن اس کے دل میں واقعی غریبوں کی ہمدردی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ رہ جاتا تو بہت بڑا لیڈر بنتا"۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کھانے کے کمرے کی طرف سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اس نے چیخ کر اعلان کرنا شروع کیا "سمورا زندہ ہے۔ وہ کھانے کے کمرے میں بیٹھا ہے"

مجمع میں شور بلند ہوا "زندہ ہے! کھانے کے کمرے میں بیٹھا ہے وہاں کیا کر رہا ہے وہ؟"

سب لوگ کھانے کے کمرے کی طرف دوڑے۔ وہاں یہ منظر تھا کہ سمورا کے سامنے کھانے کی میز پر گوشت اور سلاد سے بھری ہوئی پلیٹ رکھی تھی اور وہ جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ اس نے کسی کی طرف توجہ نہ دی اور کھانے میں مگن رہا۔ اس کے دو تین دوست آگے بڑھے اور ان میں سے ایک نے سوال کیا "سمورا! یہ کیا چکر ہے؟"

سمورا نے منہ کا نوالہ نگلتے ہوئے جواب دیا "یار! یہ کیا چکر چکر کی رٹ لگائی ہوئی ہے تم لوگوں نے۔ نہ کھاؤ تو چکر۔ کھاؤ تو چکر۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو تم لوگ؟"

ایک دوست نے بڑے غصے سے کہا "تو کیا اب دنیا سے بھوک اور غربت ختم ہو گئی جو تم کھاتے چلے جا رہے ہو؟"

سمورا نے خالی پلیٹ اپنے سے دور کھسکاتے ہوئے کہا "چلو تم اس میں خوش ہو تو اب اور نہیں کھاؤں گا لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں نے عمر بھر برت رکھنا ہے۔ بات بس ایک ہفتے کی تھی کل رات ہفتہ پورا ہو گیا"۔

دوسرا دوست بولا "لیکن یہ بتاؤ کہ ایک ہفتہ فاقہ کرنے کے باوجود تم تن درست کیسے رہے اور تمھاری توانائی میں کوئی فرق کیوں نہیں پڑا؟"

سمورا نے پھلوں کے رس کے دو تین گھونٹ لیے اور کہنے لگا "فاقے کس کم بخت نے کیے' میں تو...."

دوست نے غصے سے اس کی بات کاٹی اور بولا "اچھا تو تم چھپ کر کھانا کھاتے رہے اور ہمیں دھوکا دیتے رہے! تو یہ چکر چلایا"۔

سمورا نے بھی دوست کی بات کاٹی اور بولا "ارے ارے پھر وہی چکر کی بات! بھائی چکر وکر کوئی نہیں ہے۔ خود سوچو کہ میں کھانا کیسے اور کب کھاتا۔ تم سب تو سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اچھا اب شور نہ مچاؤ۔ میری بات غور سے سنو۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے فاقوں کا راز کیا ہے"۔

ایک اور دوست بولا "میرے بھائی' باہر میدان میں آجاؤ۔ بہت سے لوگ روحانی قوت کے کرشمے دیکھنے کے لیے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا ان کا بھی تو سامنا کرو"۔

سمورا نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں ان کا بھی سامنا کروں گا۔ کیوں نہیں کروں گا۔ کیا میں نے ان سے کہا تھا کہ میری روحانی قوت کے قائل ہو جائیں؟"

سمورا اور اس کے دوست باہر آئے اور لوگوں کا شور ذرا کم ہوا تو سمورا نے بولنا شروع کیا

"بھائیو! بات اتنی سی ہے کہ 1997ء میں مختلف ملکوں کے بڑے بڑے سائنس دان سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے سائنسی تحقیق کی بنیاد پر کچھ پیش گوئیاں کیں۔ ان میں ایک پیش گوئی یہ بھی تھی کہ 2015ء تک ایسی گولیاں تیار کر لی جائیں گی جن میں بھرپور غذائیت ہو گی۔ یعنی ان گولیوں کے کھانے سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور جسم کی توانائی بھی باقی رہے گی۔

یوں تو بیسویں صدی کے آخری آدھے حصے میں خلائی سفر پر جانے والوں اور امریکی آبدوزوں کے عملے کے لیے ایسے کھانے تیار کر لیے گئے تھے جو بہت کم جگہ گھیرتے تھے۔ ان کھانوں کو منجمد کرنے خشک کر کے اور دبا دبا کر ان کا حجم بہت کم کر دیا جاتا تھا۔ جب کھانے کے وقت ان میں پانی ملایا جاتا تو ان کا حجم اور وزن تقریباً سولہ گنا بڑھ جاتا تھا۔ تاہم ہر غذا میں یہ خصوصیت نہیں تھی۔ بس خاص خاص غذائیں یہ شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

1997ء کی پیش گوئی دو سال پہلے ہی یعنی آج 2013 میں صحیح ثابت ہو گئی اور سائنس دانوں نے غذائیت سے بھرپور ایسی گولیاں ایجاد کر لی ہیں جن میں پانی ملا کر ان کا حجم اور وزن بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس گولی کھائیے اور جان بنائیے۔ یہ گولیاں طویل عرصہ تک صحیح حالت میں رہیں گی۔ انھیں رکھنے کے لیے نہ ریفریجریٹر کی ضرورت ہے نہ فریزر کی۔ آپ کہیں جائیں' کہیں بیٹھیں بس جیب سے چند گولیاں نکالیں اور کھالیں۔ جس طرح دوستوں سے آنکھ بچا کر میں کھاتا رہا ہوں۔ میرا پیٹ بھی بھرتا رہا اور طاقت بھی برقرار رہی۔

رہی بات زبان کے چٹخارے کی تو وہ ان گولیوں میں نہیں۔ اب جب کچھ دن میں خلائی بستیاں آباد ہوں گی اور ہماری دنیا والے چاند میں گھر بنائیں گے تو ہماری دنیا سے یہ گولیاں ان بستیوں کو برآمد کی جا سکیں گی۔ وہاں ان کی زبردست مارکیٹ ہو گی۔

سائنس دانوں نے ان گولیوں کے تجربے کی خاطر مختلف ملکوں اور مختلف آب و ہوا میں دو سو آدمیوں کو چنا تھا جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ غالباً مجھے اس لیے چنا گیا کہ میرے پیٹو ہونے کی بڑی شہرت تھی۔ تجربہ کام یاب رہا اور طبی معائنہ سے پتا چلا کہ ان گولیوں سے کسی کی صحت پر برا اثر نہیں پڑا۔ تو یہ تھا میرے فاقوں کا راز۔ اب یہ گولیاں بازار میں آ گئی ہیں اور بہت سے لوگوں کو کھانا پکانے' اسے بار بار گرم کرنے اور منجمد کرنے سے چھٹی مل جائے گی۔ لیکن شاید زبان کا چٹخارا حرام نہ ہو گا۔ ممکن ہے سائنس دان کچھ دن میں اس کا بھی کوئی حل تلاش کر لیں۔

دوسرا دوست بولا "لیکن یہ بتاؤ کہ ایک ہفتہ فاقہ کرنے کے باوجود تم تن درست کیسے رہے اور تمہاری توانائی میں کوئی فرق کیوں نہیں پڑا؟"

سمورا نے پھلوں کے رس کے دو تین گھونٹ لیے اور کہنے لگا "فاقے کس کم بخت نے کیے' میں تو..."

دوست نے غصے سے اس کی بات کاٹی اور بولا "اچھا تو تم چھپ کر کھانا کھاتے رہے اور ہمیں دھوکا دیتے رہے! تو یہ چکر چلایا"۔

سمورا نے بھی دوست کی بات کاٹی اور بولا "ارے ارے پھر وہی چکر کی بات! بھائی چکر وکر کوئی نہیں ہے۔ خود سوچو کہ میں کھانا کیسے اور کب کھاتا۔ تم سب تو سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اچھا اب شور نہ مچاؤ۔ میری بات غور سے سنو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرے فاقوں کا راز کیا ہے"۔

ایک اور دوست بولا "میرے بھائی' باہر میدان میں آجاؤ۔ بہت سے لوگ روحانی قوت کے کرشمے دیکھنے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا ان کا بھی تو سامنا کرو"۔

سمورا نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں ان کا بھی سامنا کروں گا۔ کیوں نہیں کروں گا۔ کیا میں نے ان سے کہا تھا کہ میری روحانی قوت کے قائل ہو جائیں؟"

سمورا اور اس کے دوست باہر آئے اور لوگوں کا شور ذرا کم ہوا تو سمورا نے بولنا شروع کیا

"بھائیو! بات اتنی سی ہے کہ 1997ء میں مختلف ملکوں کے بڑے بڑے سائنس دان سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے سائنسی تحقیق کی بنیاد پر کچھ پیش گوئیاں کیں۔ ان میں ایک پیش گوئی یہ بھی تھی کہ 2015ء تک ایسی گولیاں تیار کر لی جائیں گی جن میں بھرپور غذائیت ہو گی۔ یعنی ان گولیوں کے کھانے سے پیٹ بھی بھر جائے گا اور جسم کی توانائی بھی باقی رہے گی۔

یوں تو بیسویں صدی کے آخری آدھے حصے میں خلائی سفر پر جانے والوں اور امریکی آبدوزوں کے عملے کے لیے ایسے کھانے تیار کر لیے گئے تھے جو بہت کم جگہ گھیرتے تھے۔ ان کھانوں کو منجمد کر کے خشک کر کے اور دبا دبا کر ان کا حجم بہت کم کر دیا جاتا تھا۔ جب کھانے کے وقت ان میں پانی ملایا جاتا تو ان کا حجم اور وزن تقریباً سوا گنا بڑھ جاتا تھا۔ تاہم ہر غذا میں یہ خصوصیت نہیں تھی۔ بس خاص خاص غذا میں یہ شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

1997ء کی پیش گوئی دو سال پہلے ہی یعنی آج 2013 میں صحیح ثابت ہو گئی اور سائنس دانوں نے غذائیت سے بھرپور ایسی گولیاں ایجاد کر لی ہیں جن میں پانی ملا کر ان کا حجم اور وزن بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس گولی کھائیے اور جان بنائیے۔ یہ گولیاں طویل عرصہ تک صحیح حالت میں رہیں گی۔ انہیں رکھنے کے لیے نہ ریفریجریٹر کی ضرورت ہے نہ فریزر کی۔ آپ کہیں جائیں' کہیں بیٹھیں بس جیب سے چند گولیاں نکالیں اور کھالیں۔ جس طرح دوستوں سے آنکھ بچا کر میں کھاتا رہا ہوں۔ میرا پیٹ بھی بھرتا رہا اور طاقت بھی برقرار رہی۔

رہی بات زبان کے چٹخارے کی تو وہ ان گولیوں میں نہیں۔ اب جب کچھ دن میں خلائی بستیاں آباد ہوں گی اور ہماری دنیا والے چاند میں گھر بنائیں گے تو ہماری دنیا سے یہ گولیاں ان بستیوں کو برآمد کی جا سکیں گی۔ وہاں ان کی زبردست مارکیٹ ہو گی۔

سائنس دانوں نے ان گولیوں کے تجربے کی خاطر مختلف ملکوں اور مختلف آب و ہوا میں دو سو آدمیوں کو چنا تھا جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ غالباً مجھے اس لیے چنا گیا کہ میرے پیٹو ہونے کی بڑی شہرت تھی۔ تجربہ کام یاب رہا اور طبی معائنہ سے پتا چلا کہ ان گولیوں سے کسی کی صحت پر برا اثر نہیں پڑا۔ تو یہ تھا میرے فاقوں کا راز۔ اب یہ گولیاں بازار میں آئیں گی اور بہت سے لوگوں کو کھانا پکانے' اسے بار بار گرم کرنے اور منجمد کرنے سے چھٹی مل جائے گی۔ لیکن شاید زبان کا چٹخارا پورا نہ ہو گا۔ ممکن ہے سائنس دان کچھ دن میں اس کا بھی کوئی حل تلاش کر لیں۔

"پھوپھو جان! آپ اپنے آپ کو کیوں مجرم سمجھتی ہیں' میری امی جان نے تو بتایا ہے کہ میں پیدائشی طور پر ایک ٹانگ سے معذور ہوں" نوید نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔

"نہیں بیٹا یہ جھوٹ ہے" نوید کی پھوپھو نے چونک کر کہا "اصل بات یہ ہے کہ میری بیٹی رئیسہ جو اکلوتی ہے' اپنے اکلوتے پن کی وجہ سے ننھیال اور ددھیال دونوں کی بڑی لاڈلی ہے۔ جب یہ تین ماہ کی تھی تو اس کے ابا بحرطانیہ چلے گئے اور جب یہ تقریباً دو سال کی ہوئی تو وہ واپس آ گئے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ بولنے والی گڑیا' چابی والی گڑیا گاڑیاں' ٹیلی فون غرض قسم قسم کے کھلونے تھے۔ یہ اکیلی ہی ان سے کھیلتی رہتی اور جب یہ میرے ساتھ اپنی نانی اماں کے گھر جاتی تو اس کا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ آپ کے ابو یعنی اس کے ماموں اس کو بہت سی چیزیں لا کے دیتے مگر اس کا مزاج بگڑا ہی رہتا۔ یہ تمہارے گھر میں بہت توڑ پھوڑ کرتی اور بچوں بڑوں سب کو بدتمیزی سے پکارتی۔ بچوں پر تشدد کرتی۔ اگر کوئی گھر میں اسے ذرا بھی گھورتا تو اس کی نانی یعنی میری امی جان کے ماتھے پر فوراً بل آجاتے اور وہ غصے سے کہتیں "میری ایک ہی بیٹی ہے اور آگے اس کی بھی ایک ہی بیٹی ہے' اسے کوئی کچھ نہ کہا کرے۔ ننھیال آکر بچے جو بھی چاہے کریں انہیں ٹوکنے کا کسی کو حق نہیں"۔

پھر رئیسہ کی امی نے نوید کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس طرح بے جا لاڈ پیار سے رئیسہ کی عادتیں بگڑتی چلی گئیں۔ جب کسی بچے کے اچھے کام پر شاباش دینے والا اور برے کام پر ٹوکنے والا نہ ہو تو بھلا اسے یہ کیسے پتا چلے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسی طرح رئیسہ کو بھی اب اچھے اور برے میں تمیز کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کا کہنا نہ مانتی' دکانوں سے الم غلم چیزیں لاتی اور کھاتی رہتی"۔

"مگر پھوپھو اس میں بھلا میرے ٹانگ سے معذور ہونے کا کیا تعلق؟" نوید نے کہا۔

"نوید بیٹا یہ بھی بتاتی ہوں" نوید کی پھوپھو نے یہ کہتے ہوئے نوید کے معذور ہونے کی اصل کہانی یوں شروع کی "جب تم پیدا ہوئے تو اسی دن میرے بھائی نے مجھے فون کیا جس میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھتیجا دیا ہے۔ میں کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد آپ کو دیکھنے پہنچ گئی۔ رئیسہ بھی میرے ساتھ تھی۔ یہ بچے بھی بڑے ذہین ہوتے ہیں"۔ نوید کی پھوپھو کی آنکھوں میں اچانک چمک آ گئی تھی "ہم سب گھر والے سر جوڑے بیٹھے تھے کہ تمہارا کیا نام رکھیں۔ بیسیوں نام سامنے آئے مگر ہم کسی پر بھی متفق نہ ہوئے۔ آخر کار پانچ ناموں پر قرعہ ڈالا گیا۔ اس قرعہ اندازی میں جو نام نکلا وہ نوید تھا۔ مگر ہماری اس مصروفیت کے دوران میں رئیسہ آپ کا نام رکھ چکی تھی"۔

"وہ کیا نام تھا پھوپھو جان" نوید نے تجسس بھری نظروں سے پوچھا۔

"یہ جو ہم آپ کو کبھی کبھار نوید کے بجائے "کاکا بھائی" کہتے ہیں یہ اسی کا رکھا ہوا تو ہے۔ جب ہم آپ کے گھر پہنچے تو امی نے اپنے پوتے یعنی آپ کو گود میں لے رکھا تھا۔ پھر ہم آپ کا نام تجویز کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رئیسہ کو پاس بلا کر پیار کیا تو رئیسہ نے ضد کی کہ "کاکا بھائی" مجھے پکڑا دیا جائے۔ بس رئیسہ کے منہ سے "کاکا بھائی" کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ سب نے آپ کو کاکا بھائی کہنا شروع کر دیا۔ رئیسہ کا جب اٹھانے کا اصرار بڑھا تو میری امی نے سب کے منع کرنے کے باوجود آپ کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ وہ کافی دیر تک کاکا بھائی کو آرام سے پکڑ کر بیٹھی رہی۔ وہ بہت خوش تھی۔ جب ہم جانے لگے تو رئیسہ نے ایک بار پھر ضد شروع کر دی۔ اب کی بار اس کی ضد یہ تھی کہ میں نے "کاکا بھائی" کے پاس ہی رہنا ہے اور کسی کھلونے سے نہیں کھیلنا بلکہ صرف اور صرف اس سے کھیلنا ہے' آپ نے جانا ہے تو چلی جائیں۔ میں تو نانی اماں کے پاس ہی رہوں گی۔

رئیسہ اس وقت تین سال کی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بیٹا میرا آپ کے بغیر دل نہیں لگے گا۔ لیکن اس نے میری ایک نہ مانی۔ آخرکار میں اسے چھوڑ کر اپنے سسرال آ گئی۔

"میں نے فون پر پتا کیا کہ رئیسہ اداس تو نہیں تو اس کی نانی اماں نے کہا کہ وہ سارا دن بولنے والی گڑیا کی طرح "کاکا بھائی" سے کھیلتی رہتی ہے"۔

پھر نوید کی پھوپھو نے نوید کو بتایا "رئیسہ پھر کبھی کبھی مجھے ملنے آتی لیکن ادھر آ کر اس کا دل نہ لگتا اور وہ پھر جلد ہی "کاکا بھائی" کے پاس جانے کا مطالبہ کر دیتی۔ ابھی "کاکا بھائی" یعنی آپ ایک ماہ اور پانچ دن کے ہی ہوئے تھے کہ آپ پر سردی کا شدید حملہ ہو گیا۔ سانس کے اندر لے جانے اور باہر لانے میں عجیب سیٹی کی سی آواز آنے لگی۔ ڈاکٹر کو چیک کروایا تو اس نے بتایا کہ آپ کو دوہرا نمونیہ ہو گیا ہے۔ بظاہر اس میں سارا قصور رئیسہ کا تھا کیونکہ وہ ایک منٹ بھی آپ کو بستر پر نہ رہنے دیتی تھی۔ کبھی وہ چھوٹے چھوٹے بستر زمین پر بچھاتی اور کسی بے جان گڑیا کی طرح آپ کو زمین پر لٹا دیتی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس میں سارا قصور ہم خواتین کا ہے جو بچوں کی ان کے ننھیال میں ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتی ہیں۔

خیر جب آپ ایک ماہ اور پندرہ دن کے ہوئے تو ایک دن رئیسہ صبح منہ اندھیرے ہی آپ کو بستر سے نکال لائی

اور خود ہی جھولے میں ڈالنے لگی۔ نوید بیٹا' آپ اس وقت رونے لگ پڑے تھے۔ پھر نہ جانے آپ کو کیا تکلیف ہوئی کہ اچانک بہت چیخے اور چلائے۔ لیکن آپ کی آواز گھر کی کسی عورت تک نہ پہنچی۔ رئیسہ نے آپ کے رونے کی آواز سن کر جلدی سے اوپر کمبل دیا اور جھولا ہلانا شروع کر دیا۔ جب "کاکا بھائی" یعنی آپ کی امی کے کانوں میں رونے کی آواز پڑی تو وہ دوڑ کر جھولے کے پاس آئیں۔

"کاکا بھائی" کی رو رو کر سانس پھول رہی تھی۔ "کاکا بھائی" کو اس قدر روتے دیکھ کر اس کی امی نے اپنی ساس کو آواز دی۔ "خالہ جی' یہ دیکھو بچے کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟"

وہ بھی دوڑتی ہوئی آئیں۔ جب انہوں نے اٹھایا تو کاکا بھائی کی ایک ٹانگ لٹک رہی تھی جو جھولے کے اندر آکر بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ ہم کاکا بھائی کو یعنی آپ کو اٹھا کر فوراً ہسپتال لے گئے۔ وہاں آپ کافی عرصہ داخل رہے اور بہت علاج کے بعد بھی ٹانگ مکمل طور پر ٹھیک نہ ہو سکی"۔

یہ بات مکمل کرتے ہوئے پھوپھو جان کے آنسو بار بار آنکھوں سے نیچے گر رہے تھے۔ پھر انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "نوید بیٹا! اس طرح میں اپنے آپ اور آپ کے گھر کی سب خواتین کو قصور وار سمجھتی ہوں کہ جنہوں نے رئیسہ کو اس کے ننھیال میں بے جا لاڈ پیار دے کر آپ کو ایک ٹانگ سے عمر بھر کے لیے محروم کر دیا"۔

"لیکن پھوپھو جان' میری امی نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم پیدائشی طور پر ایک ٹانگ سے محروم تھے"۔

"ہاں نوید بیٹا! آپ کی امی جان بہت عظیم عورت ہیں۔ ان کو سب کچھ پتا ہے لیکن انہوں نے آپ کو نہیں بتایا کہ کہیں آپ کے دل میں ہمارے بارے میں کوئی غلط خیال نہ آ جائے"۔

نوید بھی ماں کی طرح بہت عظیم نکلا۔ اس نے پھوپھو جان کی ساری بات سننے کے بعد مسکرا کر کہا "پھوپھو جان! آپ کیوں غم کرتی ہیں۔ اس میں کوئی بھی قصور وار نہیں۔ یہ تو میری قسمت تھی۔ قدرت کو ایسا ہی منظور تھا۔ آپ اس بارے میں نہ سوچا کریں۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اگر میں ٹانگ سے محروم نہ ہوتا تو شاید اتنا لائق نہ ہوتا۔ یہ دیکھیں یہی تو میں آپ کو دکھانے آیا تھا' آج ہی میرا رزلٹ آیا ہے اور میں اپنی ساری کلاس میں اول آیا ہوں" اور پھر نوید نے بغل میں دبائی ہوئی کتاب نکال کر پھوپھو کے ہاتھ میں تھما دی اور کہا "مجھے کلاس میں اول آنے پر یہ انعام بھی ملا ہے"۔

نوید کی پھوپھو اس کی باتیں سن کر خوش ہو گئیں اور نوید کو گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں اور دعائیں دینے لگیں کہ خدا آپ کو علم کے خزانے سے مالا مال کر دے۔ نوید پھوپھو کو خدا حافظ کہ کر ٹک ٹک بیساکھیوں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ پھوپھو دروازے میں کھڑی دور تک اس کی بیساکھیوں کی آواز سنتی رہی اور اس کی باتوں پر غور کرتی رہی کہ نوید اس چھوٹی سی عمر میں کتنی سمجھ داری کی باتیں کرتا ہے۔ پھر جب واپس لوٹیں تو رئیسہ کو صحن میں پریشان کھڑے پا کر بڑی حیران ہوئیں۔

"رئیسہ کیا بات ہے؟ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" انہوں نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"امی جان! میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں قصور بچوں اور والدین دونوں کا ہے۔ بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ ننھیال میں ہوں یا ددھیال میں' ایسے کام کرنے کی ضد نہ کیا کریں جو ان کے کرنے والے نہیں اور والدین کو بھی چاہیے کہ وہ بچوں کو ننھیال میں کھلی چھٹی نہ دے دیا کریں" رئیسہ نے کہا۔

"میری ننھی سی بچی! تم تو بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو" یہ کہتے ہوئے رئیسہ کی امی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور انہوں نے آگے بڑھ کر رئیسہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اسے خوب پیار کیا۔

☆ ☆ ☆

درس قرآن

نماز کے فائدے

بچوں کے لیے درس قرآن میں ہمارا آج کا موضوع ہے "نماز کے فائدے"۔ نماز سے متعلق قرآن عزیز کے پہلے پارہ کی دوسری سورت کی آیت نمبر43 کے ابتدائی حصے میں یوں حکم ہوا ہے

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

ترجمہ: نماز قائم کرو!

نماز کی ضرورت اور فائدوں کے بارے میں متعدد اور جگہوں پر بھی بڑے زور سے ذکر ہوا ہے۔ ہر مسلمان پر یہ پانچ نمازیں فرض کی گئی ہیں:
(1) نماز فجر' جو صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ (2) نماز ظہر' جو دوپہر کو پڑھی جاتی ہے۔ (3) نماز عصر' جو سہ پہر کے وقت ہوتی ہے۔ (4) نماز مغرب' جو غروب آفتاب کے فوراً بعد ادا ہوتی ہے۔ اور (5) نماز عشاء جو رات کو پڑھی جاتی ہے۔

یہ پانچوں نمازیں فرض ہیں' یعنی ان کے بغیر کوئی شخص مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں بنتا۔ نماز گھر یا کسی بھی صاف ستھری جگہ پر پڑھی جا سکتی ہے مگر بہترین صورت یہی ہے کہ ہر نماز مسجد جا کر باقی لوگوں کے ساتھ اکٹھے پڑھی جائے۔

ہر نماز سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ یہ ایک بلند آواز اعلان عام ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہو کر نماز کے نیک اور دلچسپ شغل میں شامل ہونے کی دعوت دینا ہے۔ نماز کے لیے جگہ اور کپڑوں کا صاف ہونا ضروری ہے۔ نماز سے پہلے صاف پانی سے وضو کیا جاتا ہے' جس سے جسم کے بڑے بڑے حصوں سے میل کچیل اور گرد و غبار دھل جاتا ہے۔ تمام نمازی امام صاحب کے پیچھے سیدھی قطاروں میں کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے زندگی کی صاف اور سیدھی راہوں میں ہدایت کے لیے مدد مانگتے ہیں۔ مل جل کر اکٹھے نماز پڑھنے سے ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی' دوستی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ احساس تنہائی اور ڈر خوف ختم ہونے لگتے ہیں۔ انسان میں خود اعتمادی اور ترقی کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ بچے جو بچپن ہی سے نماز کی لذتوں سے محظوظ ہونا شروع ہو جاتے ہیں عمر بھر برائیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ایک بااصول اور منظم مجاہد کی سی گزرتی ہے۔ زندگی کے مختلف محاذوں پر پھیلی ناکامیاں اور محرومیاں ان کے راستے روکنے میں ناکام رہتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

پتھر کے زمانے کے لوگ

شہناز خان

1963ء تک فلپائن کی حکومت کو خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں پتھر کے زمانے کے لوگ رہتے ہیں۔ پتا چلتا بھی کیسے۔ کیوں کہ پچاس ہزار ایکڑ وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے اس جنگل کے متعلق کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں کوئی انسان رہ سکتا ہے۔ وہاں آباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فضا سے دیکھو تو نیچے ہرے بھرے درختوں کے سوا جو ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں، کچھ نظر نہیں آتا۔ اتنے گھنے جنگل کے درختوں سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا ہے، جو اوس ہوتی ہے۔ اسی لیے انہیں بارش برسانے والے جنگل کہا جاتا ہے۔ وہاں اونچی نیچی پہاڑیاں بھی ہیں، ندیاں بھی بہتی ہیں لیکن ان ٹکڑوں، پہاڑیوں اور ندیوں کو سر کے بالوں کی طرح گھنے جنگل نے چھپا رکھا ہے۔ وہاں اتنی سی جگہ بھی نظر نہیں آتی جہاں ہیلی کاپٹر اتارا جا سکے۔ 1963ء کے دوران میں جزائر فلپائن کے ایک جنوبی جزیرے منڈاناؤ کا رہنے والا "ودحل" نام کا ایک آدمی اس جنگل میں اس مقصد لیے گھوم پھر رہا تھا کہ درخت کاٹ کر عمارتی لکڑی کی تجارت کی جائے۔ یہ ایک ذاتی قسم کا جائزہ تھا۔ جو ودحل لیتا پھر رہا تھا۔ ایک روز اسے نم ناک زمین پر انسانی پاؤں کے واضح نشان نظر آئے جو تازہ تھے۔ ودحل کو یقین تھا کہ اس جنگل میں اس کے سوا کوئی دوسرا انسان نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے پاؤں کے نشان حیرانگی کی بات تھی۔ انہیں دیکھتے ہوئے ودحل چلتا گیا۔ تھوڑی ہی دور اسے تین آدمی نظر آئے۔ وہ بالکل ننگے تھے۔ صرف کمر کے گرد انہوں نے بڑے بڑے دو پتے یا باندھ رکھے تھے جیسے یہ کپڑا ہو۔ وہ ایک ایسی لاٹھی سے جس کا سرا برچھی کی مانند تھا ایک درخت کی جڑ اکھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ودحل کو دیکھ کر وہ تینوں جنگل کے ڈرپوک جانوروں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ ودحل ان کے پیچھے دوڑا اور ساتھ ساتھ انہیں پکارنے بھی لگا۔ ودحل نے پیار اور دوستی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے انہیں پکارا۔ آگے ایک ندی آئی۔ وہ تینوں اس ندی میں اتر گئے اور درمیان میں جا کر رک گئے۔ ودحل ندی کے کنارے پہنچ گیا اور مسکراتے ہوئے ان کے قریب گیا۔ وہ تینوں خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔ اس قسم کے جنگلی لوگوں میں عام طور پر درندگی ہوتی ہے۔ بعض تو انسان کا گوشت تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن ان تینوں کے انداز میں صرف خوف تھا۔ یہ ننگ دھڑنگ انسان ابھی تک پتھر کے زمانے میں رہ رہے تھے اور پہلی بار اس نئے دور کا ایک انسان دیکھ رہے تھے۔ قدیم زمانے کا انسان اور جدید زمانے کا انسان ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے اور دونوں فریق ہی ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

یہ تین آدمی تاساڈائی قبیلے کے تھے۔ جنہوں نے ودحل کی صورت میں یہ دریافت کر لیا کہ انسان کس قدر بدل گیا ہے اور ودحل نے انسان کی سادگی اور قدرتی پن دریافت کر لیا۔ یہ نہایت ہی اہم اور عجیب و غریب دریافت تھی۔ ودحل نے منڈاناؤ کے افسر کو اطلاع دی کہ اس جنگل میں قدیم زمانے کے انسان آباد ہیں۔ جن کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ ان کے رہنے سہنے کے طور طریقے کیسے ہیں۔ اس دریافت کے بعد غیر ملکی سیاحوں نے اس جنگل میں جانا شروع کر دیا مگر کوئی بھی اس جگہ تک نہ پہنچ سکا جہاں یہ قدیم انسان رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی یہ بھی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں رہتے ہیں، غاروں میں یا درختوں پر۔

اس جنگل میں پہاڑیاں اتنی دشوار گزار ہیں کہ ان پر چڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ 1971ء میں ایک صحافی کیسٹو میگیلیش اور ایک فوٹو گرافر جان نانس اس علاقے کے ایک ایسے قبائلی کو جو جنگل کی زبان سے کچھ واقفیت رکھتا تھا اور انگریزی بھی بول سکتا تھا، اپنے ساتھ لے گئے۔ پہلے اس جنگل میں دور اندر ایک پارٹی بھیجی گئی۔ انہوں نے ایک مضبوط درخت پر مچان بنائی۔ اطلاع ملنے پر دونوں

سیاح اپنے راہ نما کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں گئے۔ ہیلی کاپٹر کو چٹان کے اوپر فضا میں معلق کیا گیا۔ اس کے سوار چٹان میں اترے اور وہاں سے درخت کے ذریعے نیچے آ گئے۔ ہوا باز ہیلی کاپٹر لے گیا۔ یہ لوگ درخت سے نیچے اترے تو انھیں پتا چلا کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔ وہ ایک ایسی پہاڑی پر تھے جس کی ڈھلان تقریباً عمودی تھی۔ وہ اس پہاڑی سے درختوں اور انگور کی بیلوں کے سہارے نیچے اترے۔ ان کے راہ نما نے بتایا کہ انھیں ایسی ہی ایک اور پہاڑی پر چڑھنا پڑے گا۔ اس نے پہاڑی دکھائی تو وہ اس سے زیادہ مشکل اور خطرناک تھی جس سے وہ اترے تھے۔ یہ لوگ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ کئی جگہوں پر انھیں پیٹ کے بل رینگ کر اوپر جانا پڑا۔ وہ پسینہ بہاتے اور ہانپتے کانپتے اوپر جاتے رہے۔ اگر درخت' ان کی باہر نکلی ہوئی جڑیں اور انگور کی بیلیں نہ ہوتیں تو ایسی پہاڑی پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ جب تھک کر چور ہو گئے اور انھیں کچھ ہوش نہ رہا کہ ان کے اردگرد کیا ہے تو ان کا راہ نما رک گیا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سب نے ادھر دیکھا۔ وہاں انھیں تین غاروں کے وسیع دہانے نظر آئے۔ یہ اتنے اونچے اور چوڑے تھے کہ غاروں کے اندرونی حصے بھی نظر آتے تھے۔

سیاح ان غاروں کے نیچے اور ذرا سا دور جا کے بیٹھ گئے تاکہ غاروں کے باسی انھیں اچھی طرح دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ وہ دوست ہیں' ان کے دشمن نہیں۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ غاروں کے دہانوں میں انسانوں کے گہرے بادامی رنگ کے چہرے نمودار ہونے لگے۔ ان کے بال سیاہی مائل اور لمبے تھے۔ بعض مسکرا رہے تھے' بعض کے چہروں پر اور آنکھوں میں حیرت تھی۔ کسی بھی چہرے پر وحشی پن تو دور کی بات ہے غصے کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔ ایک سیاح لکھتا ہے۔ "وہ غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ اپنے جسم کے قدرتی پن کو ایسے قیمتی لباسوں سے ڈھانپ کر کیا انسان کے دل میں محبت بھی رہ گئی ہے یا نہیں؟ انھیں ہماری نیت پر شک تھا البتہ ہمیں ان کی نیت پر کوئی شک نہیں تھا"۔

آخر ایک بوڑھا جنگلی غار کے منہ سے باہر آیا۔ وہ حیران کن آسانی سے دشوار گزار ڈھلان اتر کر ایک سیاح کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے شفقت سے سیاح کا گھٹنا پکڑا۔ پہلے اس پر اپنا منہ رکھا پھر اس پر تھپکی دی۔ بوڑھے کو دیکھ کر دو جوان عورتیں غاروں سے آ گئیں۔ ان کی کمر کے گرد انگور کی باریک سی ٹہنی بندھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ چوڑے پتے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سیاحوں سے پرے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہروں پر جھجک تھی۔ سیاحوں کے راہ نما نے بوڑھے کے ساتھ باتیں کیں جو کچھ اشاروں میں اور کچھ الفاظ میں ہوئیں۔

سیاحوں نے وہاں سے کچھ دور ہٹ کر کیمپ لگا لیا۔ انھیں چند دن یہاں رہ کر ان لوگوں کا جائزہ لینا تھا۔ یہ غار زمین سے کم و بیش تین سو فٹ اوپر تھے اور ڈھلان ایسی کہ پتھر لڑھکا دو تو وہ تین سو فٹ نیچے ندی میں جا گرے۔ اگلے چند دنوں میں راہ نما کی مدد سے ان لوگوں نے اپنے متعلق تمام تر معلومات دے دیں۔

یہ تاساوائی قبیلہ ہے جس کی تعداد 1971ء میں 24 تھی۔ ان میں دس مرد' پانچ عورتیں اور باقی بچے تھے۔ جن مردوں کی بیویاں نہیں وہ الگ غاروں میں رہتے ہیں۔ ان کے غاروں میں سے ہنسی اور قہقہے سنائی دیتے ہیں' رونا کوئی نہیں۔ ان کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ بچوں کو مارا پیٹا نہیں جاتا۔ غلط کام سے منع کیا جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی بہت کم کی جاتی ہے۔ خاوند خوراک کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور کھانا پکاتی ہے۔ ان کی خوراک ہر وہ چیز ہے جو کھائی جا سکتی ہے۔ مینڈک' کیکڑے' گرگٹ' کیڑے' تاڑ کے تنے کے اندر کا گودا اور بعض درختوں کے پتے ان کی خوراک ہیں۔ وہ پانی بانسوں میں بھر کر رکھتے ہیں۔ ان کے برتن پتھروں کو کھوکھلا کر کے بنائے ہوئے ہیں۔ آگ جلانے کا طریقہ وہی ہے جو آپ نے اسکول کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ ایک خاص قسم کی لکڑی کے ڈنڈے کا سرا ایسی ہی ایک اور لکڑی میں رکھ کر ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح تیزی سے گھماتے ہیں جس طرح مدھانی سے لسی بنائی جاتی ہے۔ دس سے پندرہ منٹ کی محنت کے بعد لکڑی سے شرارے نکلنے لگتے ہیں اور پھر اوپر خشک گھاس پھینک کر اور پھونکیں مار مار کر آگ جلائی جاتی ہے۔

تاساوائی قبیلے کے غاروں میں بچوں' جوانوں اور بوڑھوں کو ہنستے مسکراتے اور کھیلتے دیکھا گیا حالاں کہ انھیں زندہ رہنے کے لیے جنگل کا ظالمانہ چیلنج قبول کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ

جو خوراک کے لیے باہر جاتے ہیں تو تین تین دن اور رات باہر رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خوش رہتے ہیں۔ ان کی صحت مندی کا یہ عالم ہے کہ تین سال تک ان کا جائزہ لیا گیا۔ ان کے ہاں تین سالوں میں صرف ایک موت واقع ہوئی لیکن وہ بھی حادثے سے۔ ایک لڑکا پہاڑی سے پھسلا اور دور نیچے جا پڑا اور سر پھٹ جانے سے مر گیا۔ ان تین سالوں سے ان میں سے بیماری سے کوئی نہیں مرا۔ طب اور نفسیات کے ماہروں نے رائے دی ہے کہ بیماریوں سے محفوظ رہنے کا باعث یہ ہے کہ ان لوگوں میں غصہ اور حسد نہیں اور وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔

یہ لوگ دودھ کے نام سے ناواقف ہیں۔ وہ صرف ماں کے دودھ کو جانتے ہیں۔ ہر بچہ دو ڈھائی سال تک ماں کا دودھ پیتا ہے۔ اس کے بعد انہیں دودھ نہیں ملتا۔

سیاحوں نے جب ان سے پوچھا کہ وہ کب سے یہاں ہیں تو ایک بوڑھے نے جواب دیا۔ "ہمیشہ سے 'میرا باپ اس کا باپ اور پھر اس کا باپ یہیں پیدا ہوئے تھے"۔

اس قبیلے میں یہ خوبی ہے کہ اگر ان کے پاس خوراک نہ ہو اور باہر بارش ہو' جو کئی کئی دن ہوتی رہتی ہے' تو غار میں جو خوراک ہوتی ہے وہ سب سے پہلے بچوں کو دی جاتی ہے۔ جب بچے کھا چکتے ہیں تو باقی خوراک [illegible] میں بانٹ لیتے ہیں۔ جب سیاحوں نے ان سے یہ سوال کیا کہ ان کا لیڈر یا سردار کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ کوئی بھی نہیں۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہو جائے تو سب مل کر طے کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر ایک تاساڈائی نے کہا "تمام انسانوں کو ایک [illegible] ہونا چاہیے۔ ہم ایک انسان کی مانند سوچتے ہیں' اس لیے ہم میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا"۔

ایک سیاح نے [illegible] طور پر دن اور رات روشنی کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ بوڑھے نے ٹارچ ہاتھ میں لے کر [illegible] اس نے شک کی [illegible] ٹارچ واپس کر دی اور کہا [illegible] ہم اس کو نہیں [illegible] کیوں کہ اس سے آگ نہیں جلتی"۔

"تو [illegible] جنگل میں [illegible]

رکھو۔ یہ جنگل میں تمہیں راستہ دکھائے گی۔ جانوروں اور سانپوں سے بچائے گی"۔

"یہاں ایک پرندہ ہے جس کی ہم عزت کرتے ہیں" بوڑھے نے کہا "اگر وہ شام کے بعد بولے تو ہم باہر نہیں جاتے۔ یہ پرندہ ہمیں خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر دیتا ہے۔ اگر اس کے بولنے کے باوجود کوئی باہر چلا جائے تو وہ مارا جاتا ہے۔ اس لیے ہم تمہاری اس مصنوعی روشنی کے بغیر خطروں سے محفوظ رہتے ہیں"۔

ایک سیاح نے پوچھا "جب کوئی مر جاتا ہے تو تم اس کی لاش کا کیا کرتے ہو؟"

"ہم اسے جنگل میں لے جاتے ہیں" جواب ملا۔ "اور اسے پتوں سے ڈھانپ آتے ہیں۔ پھر ہم اسے دیکھنے نہیں جاتے"۔

"منداناؤ کے کمشنر کا ارادہ ہے کہ ان لوگوں کو جدید تہذیب کے قریب لایا جائے اور ان سے پتھر کے اوزار اور کلہاڑے لے کر انہیں فولاد کے اوزار اور چاقو دیے جائیں۔ اب تو فلم کمپنیوں کے کیمرے بھی وہاں پہنچ گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے لوگ بھی وہاں جاتے ہیں۔ ایک تاساڈائی نے ایک اخباری نمائندے سے کہا "ہمیں وہ چیز بالکل پسند نہیں جو ہماری آواز اڑا لے جاتی ہے"۔

وہ ٹیپ ریکارڈر کے متعلق شکایت کر رہا تھا۔ ان کی آواز ریکارڈ کر کے انہیں سنائی جاتی ہے۔ فلپائن کی حکومت نے اس جنگل کو سرکاری ریزرو قرار دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی منداناؤ کے کمشنر نے تاساڈائی کے افراد سے ملاقات کر کے انہیں چاقو اور فولاد کے کلہاڑے وغیرہ دیے ہیں اور انہیں نئی تہذیب کے قریب لانا شروع کر دیا ہے۔ یہ لوگ کچھ پریشان ہیں۔ کہتے ہیں ہم گھور کر دیکھنے اور اونچی آواز میں بولنے کے عادی نہیں۔ لوگوں سے کہو کہ ہمارے ساتھ آہستہ بولیں اور ہمیں گھور کر نہ دیکھیں۔

مفکروں نے کہا ہے کہ ان لوگوں کو جنگل سے اور پتھر کے زمانے سے نکال کر دور جدید میں لانے کے اقدام قابل تعریف ہیں۔ لیکن یہ بات اور زیادہ اچھی ہوگی کہ اگر ہم اس پیغام پر عمل کریں جو وہ پتھر کے زمانے سے اپنے ساتھ لائے ہیں یعنی "تمام انسانوں کو ایک انسان ہونا چاہیے"

☆ ☆ ☆

ملا نصر الدین اور بسنت
پیر مرچوں والی سویاں کھلائی تھیں! آج اس کا
بدلہ لے لیا!!
ابو ڈور
ختم ہو گئی ہے
تو جی اس سے باندھ
دیتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ زندہ دفن کر کے نکال لینے سے بچے ہر بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔

تین اعضا

تین اعضاء دل، پھیپھڑے اور جگر ایک ہی آپریشن سے انگلینڈ کی ایک عورت "ڈیوینا تھامسن" کے جسم میں لگائے گئے تھے۔ یہ کامیاب آپریشن جس میں 7 گھنٹے صرف ہوئے 'پَیپ ورتھ' ہسپتال کیمبرج میں "ڈاکٹر جان والورتھ" اور پروفیسر "سر رائے کیلنے" کی قیادت میں 15 ڈاکٹروں کی ٹیم نے 17 اکتوبر 1986ء کے روز کیا تھا۔

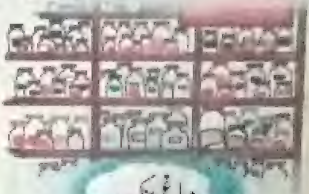

دماغ بنک

برطانیہ کے ایک کلینک میں آٹھ ہزار دماغ موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی دماغ سوچنے کے قابل نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی پاگل خانہ ہے جس میں آٹھ ہزار پاگل داخل ہیں اور کسی ایک کا بھی دماغ سوچنے کے قابل نہیں۔

جی نہیں... اصل بات یہ ہے کہ اس کلینک میں آٹھ ہزار انسانی دماغ موجود ہیں۔ ہر دماغ الگ سیال دوائی میں رکھ کر محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ انسانی دماغوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اس کلینک کا نام "کارنیکس" ہے۔ جو لندن کے قریب "ایکس" میں ہے۔ یہ دماغ ایک تحقیقی منصوبے کے لیے اکٹھے کرنے شروع کیے گئے تھے۔ اس منصوبے کا انچارج ڈاکٹر کلائیو برلان ہے۔ یہ دماغ ذہنی مریضوں کی کھوپڑیوں میں سے ان کے مرنے کے بعد نکالے جاتے رہے ہیں۔ اس کام کی ابتدا دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے کی گئی تھی اور ان کا سٹور ہوائی حملوں سے بچنے والی ایک زمین دوز پناہ گاہ میں بنایا گیا تھا۔ عام لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ 1950ء میں یہ دماغ "رن ویل سائیکاٹرک کلینک" میں منتقل کر دیئے گئے اور اس کی تشہیر بھی کی گئی۔ مقصد یہ بتایا گیا کہ ذہنی اور دماغی امراض کے ڈاکٹر ان دماغوں پر تحقیق کریں گے کہ ذہنی اور دماغی امراض کیوں اور کس طرح لاحق ہوئے۔ ان آٹھ ہزار دماغوں میں 15 دماغ مرے ہوئے باکسروں کے ہیں۔ ان کا سائنسی معائنہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ مسلسل مکے پڑتے رہنے سے دماغ کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ ان تمام دماغوں کی الگ الگ ہسٹری ہر دماغ کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً دماغ کے مالک کا نام، کیا ذہنی مرض اور اس کا کیا علاج کیا گیا۔ رن ویل کلینک نے بلڈ بنک کی طرح باقاعدہ دماغ بنک بنا دیا ہے اور اسے بین الاقوامی حیثیت دے دی ہے۔ کلینک نے تشہیر کی ہے کہ ذہنی امراض کے مریض وصیت لکھ دیں کہ وہ مر جائیں تو ان کے دماغ تحقیق کے لیے نکال لیے جائیں۔

پہلا تبدیل شدہ دل

پہلا دل 3 دسمبر 1967ء کو جنوبی امریکا کے ایک ہسپتال میں کان سکی کے جسم میں اس کا پرانا دل نکال کر لگایا گیا تھا۔ اس کی عمر 55 سال تھی۔ آپریشن 22 ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر کرسچیان برنارڈ کی قیادت میں کیا تھا۔ یہ دل ایک عورت ڈینس این ڈروال کے جسم سے نکالا گیا تھا جو 25 سال کی عمر میں مر گئی تھی۔ کان سکی نئے دل کے ساتھ صرف 18 دن زندہ رہا۔ دسمبر 1967ء سے فروری 1991ء تک 7831 مریضوں کے دل نکال کر دوسرے دل لگائے گئے۔ ان میں سے بیشتر افراد زندہ ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ دوسرے امراض سے نہ مرے تو تبدیل شدہ دلوں کی خرابی سے نہیں مریں گے۔ چمپینزی کا دل بھی امریکا کے مسی سی پی میڈیکل سنٹر میں ایک آدمی کے جسم میں لگایا گیا۔ 12 ڈاکٹروں کی ٹیم نے یہ آپریشن 23 جنوری 1964ء کو کیا۔ مریض کی عمر 64 سال تھی۔ یہ دل صرف 90 منٹ دھڑکا پھر ناکام ہو گیا۔

محمد عمر سلیم

دل چسپ کھیل بغیر خرچ کیے

اندھیرے کا تیر

اس کھیل میں جتنے بچے چاہیں حصہ لے سکتے ہیں۔ فرض کیجئے چھ بچے حصہ لے رہے ہیں۔ ان میں سے پکتے ہیں جو اول آئے وہ بچہ کپتان بنے گا اور باقی پانچ تیر بنیں گے۔

پانچ تیروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے۔ کپتان بیچ میں سات آٹھ فٹ قطر کا ایک دائرہ کھینچ دے اور اس دائرے کے باہر تیر کھڑے ہو جائیں۔ کپتان دائرے کے بیچ میں اس بے کار چیزیں جیسے لکڑی کے ٹکڑے، بوتلوں کے ڈھکن، چھوٹی چھوٹی بے کار شیشیاں وغیرہ ڈال دے۔ اب کپتان بلند آواز سے دس تک گنتی گنے۔ دس پورے ہوتے ہی نعرہ لگائے "تیر انداز" اور تیر جھپٹ کر بے کار چیزیں اٹھانا شروع کر دیں۔ ہر تیر زیادہ سے زیادہ چیزیں اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ کپتان جب دیکھے کہ ساری چیزیں دائرے میں سے اٹھالی گئی ہیں تو زور سے کہے "کھیل ختم"۔ سب تیر فوراً پیچھے ہٹ جائیں اور اپنے ہاتھ کی بے کار چیزیں اپنے پاؤں کے پاس رکھ کر پٹی آنکھوں پر سے کھول دیں اور پاؤں کے پاس رکھی ہوئی بے کار چیزوں کی گنتی کریں۔ جس نے سب سے زیادہ چیزیں اٹھائی ہوں گی وہ اول آئے گا اور آئندہ کا کپتان وہی اول آنے والا بچہ ہو گا اور پہلا کپتان کھیل میں حصہ نہیں لے گا اور یوں اس وقت تک یہ کھیل جاری رہے گا جب تک آخری بچہ کپتان بننے کے بجائے اندھیرے کا تیر نہیں رہ جاتا۔

برف پانی

اس کھیل کو کھیلنے کے لیے سب بچے ایک جگہ جمع ہو جائیں اور پکنے کے ذریعے آخر میں رہ جانے والے بچے کو چور بنائیں۔ یہ چور بچہ باقی بچوں کو پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ جس بچے کو پکڑ لے یا ہاتھ لگا دے اسے جلدی سے برف کر دے گا۔ جس بچے کو وہ برف کہے گا وہ اسی جگہ جم کر کھڑا ہو جائے گا۔ اب باقی بچوں کی کوشش یہ ہو گی کہ

کسی طرف سے چور بچے کا ہاتھ لگنے سے بچتے ہوئے اس برف ہونے بچے کو ہاتھ لگا کر پانی کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو برف ہوا بچہ دوبارہ کھیل میں شریک ہو جائے گا۔ چور بچے کی کوشش ہوتی کہ سب بچوں کو ہاتھ لگا کر برف کر کر انہیں برف بنائے اور دوسرے بچوں کو اسے پانی کر کر کھیل میں دوبارہ شریک نہ ہونے دے۔ اور اگر یہ چور بچہ کسی بچے کو یکے بعد دیگرے تین دفعہ برف بنا دے گا تو وہ بچہ چور بن جائے گا۔

یہی کھیل ایک اور طریقے سے بھی ہوتا ہے کہ چور بچہ جس بچے کو پہلے برف کر کر ہاتھ لگاتا ہے وہ برف بننے کے بجائے اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر وہ دونوں مل کر باقی بچوں کو ہاتھ لگا کر برف بناتے جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا بچہ برف بنے ہوئے بچوں کے قریب آکر انہیں ہاتھ لگا کر پانی نہ کر دے۔ اس طرح سب سے آخر میں برف بننے والا بچہ چور بن جاتا ہے اور یوں یہ کھیل تب تک جاری و ساری رہتا ہے جب تک بچے کھیلنا چاہیں۔

باسکٹ بال

اس میں ایک باسکٹ (ٹوکری) اور ایک بال (گیند) کی ضرورت ہوتی ہے۔ باسکٹ کے بدلے آپ گھی یا ہوٹوں کا خالی ڈبہ بھی استعمال کر سکتے ہیں اور گیند نہ ہو تو کسی ٹوٹے ہوئے مٹی یا چینی کے برتن کا چھوٹا ٹکڑا استعمال کر لیجیے۔

بچوں کی برابر تعداد کی دو ٹیمیں بنالیں۔ ڈبہ ایک میز پر رکھ دیں۔ اب پہلی ٹیم کا ایک بچہ ڈبے کے پاس کھڑا ہو جائے اور اس ہی ٹیم کے باقی بچے میز سے پانچ یا چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو جائیں اور دوسری ٹیم ایک طرف کھڑی ہو کر اپنی باری کا انتظار کرے۔

اب اس پہلی ٹیم کا ایک ایک بچہ باری باری دو قدم اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور گیند یا پتھر ڈبے میں پھینک کر اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ جو بچہ ڈبے کے پاس کھڑا ہے وہ ڈبے میں سے گیند یا پتھر نکال کر کھیلنے والے بچوں کی طرف پھینکے۔ ٹیم کا باری آنے والا بچہ اس کو کیچ کر کے اپنی جگہ سے دو قدم آگے آکر گیند ڈبے میں پھینکے اور ڈبے کے پاس کھڑا ہوا بچہ پھر جس بچے کی باری ہو گیند ڈبے سے نکال کر اس کی طرف پھینکے اور باری آنے والا بچہ دو قدم آگے آکر اسے کیچ کر کے باسکٹ میں پھینکے۔ اسی طرح پوری ٹیم کھیلے۔ جتنی دفعہ گیند ڈبے میں جائے گی اتنے ہی نمبر اس ٹیم کے ہو جائیں گے۔ جب ایک ٹیم کے سب افراد کھیل چکیں تو دوسری ٹیم بھی اسی طرح کھیل لے۔ جس ٹیم کے نمبر زیادہ ہوں گے وہ ٹیم جیت جائے گی۔

15 سال

12 سال

13 سال

11 سال

14 سال

15 سال

10 سال

15 سال

15 سال

15 سال

13 سال

15 سال

15 سال

15 سال

16 سال

13 سال

13 سال

13 سال

آئیے دوست بنائیں

نام .... عمر ....

مشاغل ....

پتا ....

ابھی نہیں تو کبھی نہیں

سلیم خان گمی

پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو بھارت کے سائنس دانوں اور فوج میں ہلچل مچ گئی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستان ایٹمی طاقت بن سکتا ہے۔ بھارت کے سیاست دان، جرنیل اور سائنس دان تو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح سائنس کے میدان میں خاص طور پر ایٹم بم بنانے کے سلسلے میں صفر ہے۔ اب جب پاکستان نے چاغی کے مقام پر ایک دم پانچ چھ ایٹمی دھماکے کیے تو بھارت کے سیاست دانوں، جرنیلوں اور سائنس دانوں نے خوف زدہ ہو کر ایک اجلاس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچنے لگے کہ اب کیا ہو؟

"پاکستان پر کسی بہانے حملہ کر دیا جائے" ایک جرنیل نے کہا۔ وہ لڑائی کے فن کا ماہر تھا چنانچہ اس نے لڑائی کا مشورہ دیا۔

"پاکستان کو ہرانا مشکل ہے" ایک سیاست دان نے کہا۔

"وہ کیسے؟" اسی جرنیل نے پوچھا جس نے پاکستان پر حملہ کا مشورہ دیا تھا۔

"پاکستان کے پاس ایٹم بم ہیں۔ جس ملک کے پاس ایٹم بم ہوں اس کو ہرانا آسان نہیں ہوتا"

"بھارت پہلے حملہ کرے اور پاکستان کے شہروں اور چھاؤنیوں کو تباہ کر دے" جرنیل نے کہا۔

"پاکستان پر اچانک حملہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا جاسوسی کا نظام بہت تیز ہے۔ اس کے علاوہ چین بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ جب کہ ہم اکیلے پاکستان کی جاسوسی کرتے ہیں لیکن ہماری جاسوسی پاکستان بھی کرتا ہے اور چین بھی" سیاست دان نے کہا۔

"ایٹمی حملہ کرنے کے لیے ہمیں تیاری کی ضرورت ہو گی۔ اس تیاری کا پتا پاکستان کو بھی چل جائے گا" ایک سائنس دان بولا۔

"اس کے علاوہ امریکا نہیں چاہتا کہ دنیا میں ایٹمی جنگ چھڑے۔ اس لیے اس کے جاسوسی طیارے دور اوپر آسمان پر گھومتے رہتے ہیں اور ہماری جاسوسی کرتے رہتے ہیں" ایک دوسرے سائنس دان نے بتایا۔

"ہمیں ایسی صورت میں بھارت کی ایٹمی جنگ کی صورت میں تین ملک لڑتے ہیں۔ ایک پاکستان، دوسرے چین اور تیسرے امریکا۔ اب بتاؤ پاکستان پر ایٹمی حملہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟" سیاست دان نے کہا۔

"اور ہو بھی تو پاکستان چوڑیاں پہنے ہوئے تھوڑی ہے۔ وہ بھی حملہ کرے گا" ایک اور سیاست دان نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"کوئی اور طریقہ سوچا جائے" ایک سائنس دان بولا۔

"اور وہ سائنسی طریقہ ہو۔ یعنی سائنس دان مل کر کوئی ایسا طریقہ سوچیں" ایک بوڑھا سیاست دان بولا۔

"آپ سائنس دانوں کا ایک بورڈ بنا دیں۔ یہ بورڈ سوچے کہ پاکستان کو کیسے تباہ کیا جا سکتا ہے"۔ بڑے سے چھوٹے سیاست دان نے تجویز پیش کی۔ چند دنوں میں سائنس دانوں کا بورڈ بن گیا۔ ان کو اربوں روپے کے فنڈ دیے جانے لگے۔ طے پایا کہ پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے مکمل تجویز تین مہینوں کے اندر اندر تیار ہو۔

سائنس دانوں کے اس بورڈ کے متعلق پاکستان کو خفیہ ذرائع سے معلوم ہو گیا اور حکومت پاکستان کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بھی اس بورڈ کا توڑ تیار کر لیا۔ توڑ یہ تھا کہ خفیہ جاسوسی سے کام لیا کہ وہ پتا کرے کہ اس بھارتی بورڈ نے پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے کیا تجویز

ہے اور وہ اس تجویز پر کیوں کر عمل کرے گا۔ تھوڑے ہی عرصے میں پتا چل گیا کہ بھارت پاکستان کے خلاف کون سا حربہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ حربہ یہ تھا کہ مغربی کوہ ہمالیہ یعنی ناکا پربت، کوہ قراقرم اور کوہ ہندو کش وغیرہ کی تمام برف کو پگھلا کر پاکستان میں زبردست طوفان لایا جائے جس سے پاکستان کے تمام شہر اور دیہات بہہ کر بحیرہ عرب میں ڈوب جائیں۔ اس غرض کے لیے ان پہاڑوں میں خاص طرح سے تیار کیا ہوا مسالہ دبایا جائے گا اور پھر "الیکٹرانک وش بٹن" سے برف آلود پہاڑوں میں زلزلہ پیدا کر کے پانی کا سیلاب پیدا کیا جائے گا جو طوفان نوح سے کسی طور پر کم نہ ہو گا۔

یہ اہم ترین اطلاع تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ الیکٹرانک وش بٹن کون سائنس دان یا انجینیر، کس جگہ سے دبائے گا کہ ایک دم چار پہاڑوں پر برف پگھلنے کا عمل ہو گا۔ اس بات کا پتا لگانے کے لیے نئے سرے سے دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بھارت سرکار اپنے سائنس دانوں کی حفاظت کے لیے کروڑوں روپے خرچ کر رہی تھی "ایٹم بم کا وار تو خالی گیا تھا اب "پانی کا وار" خالی نہیں جانا چاہیے"۔ یہ سوچتے ہوئے بھارتی حکمرانوں نے بورڈ کے مرکز کو نہایت خفیہ رکھا تھا۔ لیکن اس بار نہ چین نے مدد کی اور نہ ہی امریکا نے، پاکستان نے اپنے ذرائع سے کام لے کر، سکھوں کی مدد سے، سیلابی مرکز کا پتا لگا لیا۔ سکھ کوہ پیماؤں کی ایک ٹولی نے مقبوضہ کشمیر اور چین کے درمیان ریما نامی پہاڑ پر چڑھائی کے دوران میں معلوم کیا کہ وہاں ایک چٹان کی اوٹ میں بھارت کے سائنس دانوں کا ایک گروہ پتھروں کی قلعہ نما تجربہ گاہ میں رہتا ہے اور تجربے کرتا ہے۔ یہی وہ سائنس دان تھے جو بھارت کے اس بورڈ کے رکن تھے اور پانی کے طوفان سے پاکستان کو ملیامیٹ کرنا چاہتے تھے۔

کوہ پیماؤں کی ٹیم کے سکھ لیڈر لکھا سنگھ نے جب ریما پہاڑ کے دامن میں وسیع و عریض برفانی میدان میں ہتھیار بند سکھ کو کلاشنکوف لیے کھڑا دیکھا تو اپنے پانچ کوہ پیماؤں کو ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپا کر خود سکھ سیکورٹی گارڈ کو ملنے کے لیے اٹکی اٹکی کرتا ہوا چل پڑا۔ سیکورٹی گارڈ اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے دو ڈھائی ماہ کے بعد کوئی سکھ ساتھی دیکھا تھا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں صاحب نہیں، کوہ پیما ہوں" لکھا سنگھ بولا۔

"اکیلے ہو یا اور لوگ بھی ساتھ ہیں؟" سیکورٹی گارڈ نے پوچھا۔

"واہ گورو کی کرپا ہے، پانچ دوسرے ساتھی بھی میرے ساتھ ہیں" لکھا سنگھ نے بتایا۔

"وہ کہاں ہیں؟" سیکورٹی گارڈ کو وہ دور دور نظر نہ آتے تھے۔

"وہ پیچھے بیٹھے ہیں آپ جناب کے ڈر سے، آپ کے پاس کلاشنکوف ہے نا، اس لیے"

"لیکن ادھر تو کسی کو آنے کی اجازت نہیں سوائے فوج کے"

"ہم بھی تو فوجی ہیں اور سکھ بھی ہیں یعنی پورے پورے آپ کے ساتھی ہیں"

"اور جناب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" لکھا سنگھ نے کہا۔

"میں پہرے پر کھڑا ہوں۔ میرے ساتھ پانچ سائنس دان ہیں اور برف کو پانی بنانے کا تجربہ کر رہے ہیں" سیکورٹی گارڈ نے راز فاش کر دیا۔

"اتنی دور برف کو پانی بنا رہے ہیں۔ یہ کام تو دلی امرتسر اور جالندھر میں بھی ہو سکتا تھا" لکھا سنگھ بولا۔

"وہاں برف والے پہاڑ نہیں ہیں۔ یہاں ادھر ادھر کئی برفانی پہاڑ ہیں۔ یہ جو پہاڑوں پہ لاکھوں کروڑوں من برف ہے ناں، سب پگھل جائے گی اور پھر پانی کے پہاڑ ہر طرف نظر آئیں گے۔ سیکورٹی گارڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"پاکستان تو ڈوب جائے گا۔ غرق ہو جائے گا" لکھا

ننو نے کہا۔

"میرا خیال ہے پاکستان کے لیے ہی یہ تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا" سیکورٹی گارڈ نے بتایا۔

اب لکھا سنگھ کے لیے بھی وہاں ٹھہرنا فضول تھا کیونکہ اس کا مقصد حل ہو گیا تھا۔ اس نے سکھ سیکورٹی گارڈ سے اجازت لی اور چل پڑا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کا مشن کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن وہ حیران تھا کہ سکھ سیکورٹی گارڈ نے مزے لے لے کر سارا بھید بتا دیا۔ بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ لکھا سنگھ پاکستان کے لیے کام کر رہا ہے۔

○ ○ ○

وہ تعداد میں چھ تھے۔ صوبے دار، لیفٹننٹ، کپتان، میجر، کرنل اور لکھا سنگھ۔ وہ اسکردو ایرپورٹ کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرے کو گرم کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا کیونکہ وہ جن کپڑوں میں ملبوس تھے بہت گرم تھے۔ اس کے علاوہ ان کو سردی کا مقابلہ کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ فوجی افسر پاکستان کے تھے۔ لکھا سنگھ ان کا گائیڈ تھا۔ وہ ان کو یا دوسرے لفظوں میں ان کے ہیلی کاپٹر کو گائیڈ کرنے کے لیے ساتھ لیا گیا تھا۔ آدھی رات ہونے والی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اسکردو ایرپورٹ کے اردگرد پہاڑ گم سم کھڑے تھے۔ دریائے سندھ کا پانی آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔

"رات کے بارہ بج گئے ہیں" میجر نے کہا۔

"جنرل صاحب کو اب آجانا چاہیے" کرنل نے گھڑی پر نظر جما کر کہا۔

"ہم نے کافی انتظار کیا ہے" کیپٹن بولا۔

"جنرل صاحب آتے ہی ہوں گے" لیفٹننٹ نے آہستہ سے کہا۔

"سر ہمارا انتظار بھی ڈیوٹی میں شامل ہے" صوبے دار بولا۔

اچانک دروازہ کھلا اور جنرل اندر داخل ہوا۔ ان کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک آدمی تھا جو سفید گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا اور سر پر ایک ایسی گرم ٹوپی تھی جس میں اس کے کان، ماتھا اور ٹھوڑی چھپی ہوئی تھی۔ وہ سب کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سیلوٹ مار کر سلام کیا۔ لکھا سنگھ ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر آداب بجا لایا۔ جنرل نے ان کے سیلوٹ اور آداب کا جواب دیا اور بولا "مجاہدو! یہ ہیں ڈاکٹر اخلاق احمد، یہ کیمیا میں پی ایچ ڈی ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ مشن پر جائیں گے۔ مشن یہ ہے کہ بھارت کے ایک سائنس داں نے چند پہاڑوں کو آتش فشاں پہاڑوں میں بدلنے کے لیے بم بنائے ہیں تاکہ گرمی سے ان پہاڑوں کی ساری برف پگھل کر پانی بن جائے اور عظیم سیلاب آجائے۔ آپ بموں کو ناکارہ کریں گے اور سائنس داں کو پکڑ کر لے آئیں گے تاکہ اسے اس کی بری نیت کی سزا دی جا سکے۔ لکھا سنگھ اسکاؤٹ ہے۔ اس نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ہے۔ یہ آپ کی راہ نمائی کرے گا۔ ویسے اس ٹاسک فورس کے انتظامی طور پر انچارج کرنل داؤد خان ہیں۔ خدا حافظ" جنرل نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کرنل داؤد خان نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا

"آؤ میرے پیچھے" اس نے کہا اور کمرے سے نکل کر اس طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا جہاں ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے وہ سب ہیلی کاپٹر کی طرف بھاگے اور پھر ہیلی کاپٹر کے اندر داخل ہو گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر نے شمال کا رخ کیا اور اندھیرے کو چیر کر آگے بڑھنے لگا۔ انھوں نے آنکھوں پر خاص قسم کی عینکیں چڑھائی تھیں جن کے ذریعے ان کو رات کے وقت بھی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ درخت، جنگل، پتھر، پہاڑ، ندی نالے حتیٰ کہ رات کو شکار پر نکلنے والے درندے بھی نظر آرہے تھے۔ لکھا سنگھ پائلٹ کے پاس کھڑا اس کو گائیڈ کر رہا تھا تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ راستے میں بار بار پہاڑوں کی چوٹیاں آرہی تھیں آسمان پر بادل تھے اس لیے برف باری کا امکان نہ تھا۔

"سر! جن لوگوں کو پکڑنا یا مارنا ہے وہ پہاڑ پر ہیں، غار میں ہیں یا تہ خانے میں؟" میجر نے پوچھا۔

کرنل دلاور خاں نے گھڑی پر سے نگاہ اٹھا کر کہا "تہ خانے میں۔ ان کی تجربہ گاہ ایک پہاڑی کے ساتھ یا پہاڑی کی اوٹ میں ہے۔"

"کیا وہ جگہ لکھا سنگھ دیکھ چکا ہے؟" میجر نے پھر سوال کیا۔

"ہاں دیکھ چکا ہے" کرنل بولا۔

"ان کی سیکورٹی کیسی ہے؟" کپتان نے سوال کیا۔

"وہ محفوظ جگہ ہے۔ چاروں طرف لمبا پہاڑ پھیلا ہوا ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹیاں برف پوش ہیں۔ وادیاں برف آلود ہیں۔ میدان برف زار ہیں۔ جدھر دیکھو پہاڑیاں اور برف ہے۔"

"سر! مشن کی کامیابی کے لیے کتنا وقت درکار ہے؟" اب لیفٹیننٹ نے سوال کیا۔

"زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹا" کرنل دلاور بولا۔

"اس وقت ہم کہاں اڑ رہے ہیں صاحب؟" کرنل نے صوبے دار سے پوچھا۔

"اس وقت ہم مقبوضہ کشمیر کے شمال میں ہیں" اس نے جواب دیا۔

"بہت خوب" کرنل دلاور خاں نے کہا "صوبے دار صاحب ہمارے ساتھ اس لیے ہیں کہ جغرافیے کے ماہر ہیں۔ چپہ چپہ کو جانتے ہیں لیکن نقشے کی مدد سے۔"

ہیلی کاپٹر رات کے اندھیرے میں اڑا جا رہا تھا جیسے کشتی سیاہ پانیوں میں اتر رہی ہو۔ پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب سفید تھیں کیونکہ برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ نانگا پربت کا پہاڑ بہت پیچھے تھا۔ گلگت اور بلتستان کے علاقے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ قراقرم کی کالی پہاڑیاں اور سفید چوٹیاں بھی پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ لداخ کا علاقہ تھا جو صدیوں سے بدھ مت کے ماننے والوں کا دیس ہے اور جہاں قدم قدم پر گلوڑے (بدھ مندر) ہیں۔

"ایک زمانہ تھا جب جموں، کشمیر، لداخ، بلتستان اور گلگت پر مسلمان حکومت کرتے تھے۔ دراصل کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ پہلے بدھ مت کا پیروکار تھا۔ پھر اس نے اسلام کا مطالعہ کیا اور مسلمان ہو گیا۔ پہلے وہ شہزادہ رنچن کہلاتا تھا پھر اس نے اپنا اسلامی نام صدرالدین رکھا اور اس وقت ہم سلطان صدرالدین کے دیس پر سے اڑ رہے ہیں۔"

اب ہیلی کاپٹر کا رخ تبت کی طرف تھا۔ لیکن ابھی وہ مقبوضہ کشمیر پر اڑ رہا تھا۔ اچانک پہاڑ ختم ہو گئے اور ہیلی کاپٹر ایک لمبے چوڑے میدان پر سے اڑنے لگا۔ اب اڑان کی اونچائی کم ہو گئی تھی۔ لگتا تھا پائلٹ ریڈار سے بچنے کے لیے ہیلی کاپٹر کو نیچے لے آیا ہے یا شاید اس لیے لایا ہے کہ پہاڑ کی چوٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور اڑان کے لیے کھلا میدان مل گیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر نیچے آیا اور دس منٹ کے اندر اندر برف بھرے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے لکھا سنگھ نیچے اترا اور اس کے بعد کرنل اور اس کی ٹاسک فورس کے آدمی۔ سب سے آخر میں ڈاکٹر اخلاق احمد اترے۔ پائلٹ اور اس کے ساتھی ہیلی کاپٹر میں رہے۔

"صوبے دار صاحب آپ بھی ہیلی کاپٹر میں رہیں" کرنل نے کہا۔

"سر! میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

"اگر ہم کسی حادثے کی وجہ سے گم ہو جاتے تو پھر آپ کا

ساتھ ضروری تھا راہ نمائی کے لیے" کرنل ہنس کر بولا۔

"سر، خدا نہ کرے کوئی حادثہ پیش آئے" صوبے دار بولا۔

"پائنٹ ہتھیار بند ہیں لیکن پھر بھی ان کے پاس ایک آدمی سیکورٹی کی غرض سے رہنا چاہیے"۔

"میرے خیال میں یہاں سیکورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں کے درمیان یہ لمبا چوڑا برف کا میدان" میجر نے کہا "کسی وقت بھی سیکورٹی کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے"۔

"یس سر" صوبے دار نے کہا اور پیچھے ہٹ کر ہیلی کاپٹر کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اپنی اپنی سکی پیروں سے کس کر باندھ لی تھیں، ہتھیار چیک کر لیے تھے۔ چنانچہ وہ برف پر اسکی انگ کرتے ہوئے لکھا سنگھ کے پیچھے پیچھے ایک پہاڑ کی طرف چل دیے۔ آدھ گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد لکھا سنگھ ایک پہاڑی کے قریب پہنچا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے آنے والے بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

"سر، یہ وہ جگہ ہے جہاں میں سکھ سیکورٹی گارڈ سے ملا تھا" لکھا سنگھ بولا۔

"اب تو یہاں کوئی نہیں" کرنل دلاور خان بولا۔

"ممکن ہے وہ یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے گئے ہوں" لکھا سنگھ نے کہا۔ لکھا سنگھ نے جواب دیا

"کیسے پتا چلے کہ وہ یہاں سے اپنی تجربہ گاہ کسی اور جگہ لے گئے ہیں؟" کرنل بولا۔

"ممکن ہے انہوں نے اس تجربے کا پروگرام ختم کر دیا ہو"۔

"ہماری اطلاع کے مطابق وہ ایک نہیں کئی تجربے کر چکے تھے جو کامیاب رہے۔ اب تو وہ برفانی پہاڑوں کو پانی کے سمندر بنانے والے تھے اور اس غرض کے لیے یہاں آئے تھے" کرنل نے حتمی انداز میں کہا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میجر نے پوچھا۔

"اس کا جواب لکھا سنگھ دے سکتا ہے" کرنل نے کہا۔

"مجھے کچھ وقت سوچنے کے لیے دیجیے" لکھا سنگھ بولا۔

ابھی اس نے فقرہ مکمل کیا تھا کہ دور سے ہیلی کاپٹر کی آواز کان میں آئی۔

"سر، ہیلی کاپٹر کی آواز" لکھا سنگھ خوشی سے بولا۔

"یہ ہماری طرف آ رہا ہے کیونکہ آواز بلند سنائی دیتی ہے" کرنل بولا۔

"ہمیں یہاں سے ہٹ کر پہاڑی کی اوٹ میں ہو جانا چاہیے" میجر نے کہا اور وہ سب اسکی انگ کرتے ہوئے پہاڑی کی اوٹ میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر آیا اور اس جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں وہ پہلے کھڑے تھے۔ ہیلی کاپٹر سے تین آدمی اترے جن کے سروں پر بارود کی پیٹیاں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے برف میں سے ایک دروازہ ابھرا اور وہ تینوں دروازے کے پٹ کھول کر اندر گئے۔ دروازہ اپنی جگہ پر پہلے کی طرح کھڑا رہا۔

"آؤ" کرنل چلایا اور دروازے کی طرف بھاگا۔ باقی

ساتھی اس کے پیچھے تھے۔ کرنل اپنے ساتھیوں سمیت پتھروں کی بنی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے لکھا سنگھ کا بازو پکڑا اور اسے سب سے آگے کیا تاکہ بھارتی سائنس دان سکھ کو دیکھ کر مطمئن رہیں، گھبرا نہ جائیں۔

کرنل نے دیکھا ایک ساٹھ سال کا بوڑھا اپنے سامنے آٹھ بم رکھے کافی پی رہا تھا۔ اس کے پیچھے وہی سکھ باڈی گارڈ یا سیکورٹی گارڈ کھڑا تھا جو آٹھ دس دن پہلے لکھا سنگھ کو ملا تھا۔ "یہ آپ کے ساتھ آئے ہیں؟" بوڑھے سائنس دان نے ان تینوں فوجیوں میں سے ایک سے پوچھا جو سر پر پیٹیاں رکھ کر آئے تھے۔

"نہیں سر، ہم صرف تینوں آئے ہیں۔ کیپٹن بشیر داس ہمارا کمانڈر ہے۔ وہ ہیلی کوپٹر میں بیٹھا ہے"۔

کرنل نے فوراً میجر کے کان میں کچھ کہا تو وہ باہر بھاگا۔ دو منٹ بعد باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ باڈی گارڈ صورت حال سمجھ گیا اور اس نے لکھا سنگھ پر فائر کیا اور پھر خود کرنل کی گولی سے اوندھے منہ گرا۔ اس افراتفری میں کیپٹن اور لیفٹیننٹ نے ان تینوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جو پیٹیاں اٹھا کر لائے تھے۔ پیٹیاں چیک کی گئیں تو ان میں بارود بھرا ہوا تھا۔

"میں سمجھ گیا آپ پاکستانی ہیں۔ یہ سکھ جو آپ کے ساتھ آیا یہ بھی پاکستانی ہے اور پاکستان کے محکمہ جاسوسی کا ملازم ہے۔" بوڑھا سائنس دان بولا۔

"وہ مر گیا اسے چھوڑو، تم بتاؤ تم کون ہو؟" ڈاکٹر اخلاق نے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر وشوا مترہوں، کیمیادان"

"ہمیں معلوم ہے کہ تم نے ایسا بم ایجاد کیا ہے جو پہاڑ کو آتش فشاں پہاڑ میں بدل سکتا ہے۔ لوہے اور فولاد کو پانی کی طرح پگھلا سکتا ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں من برف کو آن کی آن میں پانی میں بدل سکتا ہے۔ جلدی سے بتاؤ اس کا نسخہ کیا ہے؟" ڈاکٹر اخلاق نے کہا۔

"میں نسخہ نہیں بتاؤں گا، جان دے دوں گا" اس نے ابھی یہ کہا تھا کہ دروازے کے راستے گونج سنائی دی۔ وہ باہر نکل آئے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک گلیشیر رواں دواں ان کی طرف آ رہا ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر کی طرف بھاگے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ اڑتا ہوا برف کا طوفان ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ پہنچ گیا جہاں تجربہ گاہ تھی اور ڈاکٹر وشوا متر ہزاروں من برف کے نیچے آٹھ بموں کے بارود کو ساتھ لیے دفن ہو گیا۔

کہانیوں میں جادو کی چھتری' عید شرارت اور زندہ لاش بہت پسند آئیں اور نظموں میں عید کا پیغام اچھی لگی۔ آپ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (فرحان حید رو دیرہ غازی خان)

جنوری کا شمارہ سارا ہی لاجواب تھا۔ نمبروں پر عید شرارت رہی۔ باقی بھی اچھی تھیں۔ جب اتنے سارے ساتھی مجرم کون؟ شروع کرنے کا اصرار کر رہے ہیں تو آپ کیوں نہیں شروع کر رہے ؟ (مسرت شاہین چشتیاں)

جنوری کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تمام کہانیاں بہترین تھی۔ خاص طور پر الو کھا نائب اور ایک سوم حق بہت پسند آئیں (ظاہر شاہ کراچی)

کہانیوں میں جادو کی چھتری 'عظیم درس گاہ اور الو کھا نائب بہت اچھی تھیں۔ 11 دن واپس کرو مضمون بہت پسند آیا۔ لطیفے بہت زبردست تھے۔ دل چسپ اور ناقابل یقین پر تو بالکل یقین نہ آیا (ماجرہ مختار رحیم یار خان)

مضمون 11 دن واپس کرو بہت اچھا رہا۔ اس کے علاوہ دل چسپ اور ناقابل یقین کا سلسلہ اور قائد اعظم کلاسک بہت شان دار ہیں۔ لطائف بھی اچھے تھے (فرحت شاہین ڈھڈی جنڈیالہ شیر خان)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور پر جادو کی چھتری 'عید شرارت اور زندہ لاش بہت پسند آئیں۔ دلچسپ اور ناقابل یقین کی تو بات ہی کچھ اور تھی (عابد حسین جگراں)

سرورق بہت ہی اچھا تھا۔ کہانیاں بھی اے ون تھیں۔ مگر الو کھا نائب 'جادو کی چھتری اور عید شرارت زبردست تھیں۔ سائنس فکشن میں حسن ذکی کاظمی کی ایک سوم حق بھی اچھی لگی۔ لطیفے بھی اچھے لگے۔ شرارتی لڑکیوں اور ملاقی اور عید کی سویاں پڑھ کر ہنسی نہ رکی (مہرین شاہ راولپنڈی)

سرورق دلفریب تھا۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ خاص طور پر جادو کی چھتری 'ایک سوم حق 'عظیم درس گاہ 'زندہ لاش اور عید شرارت بہت اچھی لگیں۔ لڑکیوں کے لیے کوئی سلسلہ شروع کریں نیز ہونہار فوٹوگرافر کا سلسلہ بھی شروع کریں (صالحہ ظفر اسلام آباد)

تعلیم و تربیت میں اور تو اولی کی تحسین مگر ایک چیز واقعی زبردست ہے اور وہ ہیں اقوال زریں۔ اقوال زریں زندگی گزارنے میں راہنمائی کرتے ہیں۔ اس لیے اس میں ان کا ہونا لازمی ہے (کلثوم مصطفیٰ لاہور)

کہانیوں میں جادو کی چھتری اور عید شرارت بے حد پسند آئیں' سائنس فکشن ہمیشہ کی طرح مزے کا تھا (عدنان حسن عابدی کراچی)

آخر خدا خدا کرکے سعید لخت صاحب نے خاموشی کے طلسم کو توڑا اور ایک دلچسپ سی کہانی لکھ کر اپنی دوبارہ باقاعدہ آمد کا اعلان کر دیا۔ ہماری اسلامی تاریخ کے درخشندہ ستارے پر ڈاکٹر رضوان ثاقب کی پکی کہانی اپنی سابقہ دلچسپی برقرار رکھے ہوئے تھی۔ دیگر کہانیوں میں فاروق حسن چاند کی تحریر بازی لے گئی جب کہ نجمہ معراج اور حسن ذکی کاظمی کی تحاریر بالترتیب دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ شہناز خان کا کیلنڈر کی تاریخ پر مضمون کافی معلومات افزا تھا۔ محترم سید نظر زیدی کا ناول دھوپ چھاؤں فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکا ہے۔ محترم حکیم سعیدی صاحب کی نظم عید کا پیغام بہت نصیحت آموز تھی۔ اگرچہ وہ اب ہم میں نہیں لیکن ان کا یہ عظیم سرمایہ انہیں زندہ و جاوید رکھے گا (خلیل احمد ملک فیصل آباد)

عید شرارت' جادو کی چھتری' عظیم درس گاہ اور کارٹون کہانی بہت پسند آئیں (شاکلہ سلطانہ فیصل آباد)

آپ ڈاک کی موصولی کی آخری تاریخ دس کر دیں۔ رکی ہونے کی وجہ سے رسالہ بہت لیٹ موصول ہوتا ہے۔ دو دن میں مطالعہ کر کے حل بھیجنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے (عائشہ عباس مونچھ)

سرورق بہت اچھا تھا اور کہانیوں میں عظیم درس گاہ اور جادو کی چھتری بہت اچھی لگیں۔ تعلیم و تربیت ہمارے گھر میں 70 کی دہائی سے آ رہا ہے۔ پہلے ہماری ماما اور بابا جانی پڑھا کرتے تھے اور اب ہمارے لیے بھی انہوں نے تعلیم و تربیت کا ہی انتخاب کیا ہے۔ یہ دن بدن اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا جا رہا ہے (قرۃ العین حقی لاہور چھاؤنی)

سرورق موقعے کی مناسبت سے لاجواب تھا۔ کہانیاں سبھی اچھی تھیں۔ نظمیں دونوں بہترین تھیں۔ لطیفے اور کارٹون کہانی پڑھ کر ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ آپ سے درخواست ہے کہ صفحوں کی تعداد بڑھا دیں (اشرف 'عائشہ رفیق گوجرانوالہ)

سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں جادو کی چھتری 'عظیم درس گاہ اور عید شرارت پسند آئیں۔ آپ مجرم کون کا سلسلہ بھی شروع کریں اور جاسوسی ناول بھی جلد شروع کریں (محمد رمضان جانی حاصل پور اوکاڑہ)

جنوری کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ عید شرارت' زندہ لاش اور

جادو کی چھتری بہت پسند آئیں۔ (قاسم محمد مغل، ساھیوال)

تمام رسالہ شاندار تھا۔ نئی پچھتر نوے سال کے موقع پر آپ رسالے کے مستقل رائٹرز کا انٹرویو بھی لیجئے۔ اس طرح ہماری ان سے ایک طرح کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ (سامرہ حسین، راولپنڈی)

سرورق بہت حسین تھا۔ کہانیوں میں انوکھا ناٹک، عظیم درس گاہ، کارٹون کہانی اور دھوپ چھاؤں بہت دلچسپ تھیں۔ اگر اقوال زریں کا سلسلہ بھی شروع کریں تو بہت اچھا ہو۔ (رضوان شاہ، صوبہ چھاؤنی)

سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں لیکن لطیفے کچھ خاص نہ تھے۔ دلچسپ اور ناقابل یقین اور کھیلوں کی دنیا بھی اچھے جا رہے ہیں۔ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (علی کامران، ملتان)

جنوری 1999ء کا شمارہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ کہانیوں میں جادو کی چھتری، زندہ لاش اور عید شرارت زیادہ پسند آئیں۔ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (محمد عاطف، آغا، لاہور)

سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں جادو کی چھتری اور زندہ لاش بہت پسند آئیں۔ ملائی اور عید کی سویاں اور لطائف نے بہت ہنسایا۔ مجرم کون؟ کا سلسلہ شروع کریں۔ (ماریہ انجم، لاہور)

بہت سے ساتھی مجرم کون کا سلسلہ شروع کرنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ آپ ان پر غور کیوں نہیں کرتے؟ (نائلہ محفوظ کیانی، راولپنڈی)

جادو کی چھتری، انوکھا ناٹک اور زندہ لاش بہترین کہانیاں تھیں۔ اس کے علاوہ دھوپ چھاؤں، کارٹون کہانی، دلچسپ اور ناقابل یقین اچھے سلسلے ہیں۔ (شفقت رسول، لیاقت پور)

اس دفعہ بھی رسالہ حسب معمول بہت اچھا لگا۔ عید شرارت بہت شاندار کہانی تھی۔ نئی کہانی کا سلسلہ جاری رکھیں اور سرورق پر قدرتی مناظر دیا کریں۔ (کامران جمیل، کامرہ کینٹ)

جنوری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ اس بار کہانی "عید شرارت" نمبر لے گئی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ خاص کر جادو کی چھتری، عظیم درس گاہ، شرارتی لکیریں اور ایک سرورق بہت اچھی تھیں۔ (مریم جاوید، لاہور)

جنوری کا سرورق بہت زبردست تھا۔ اتنا پیارا منظر اور مٹھائی دیکھ کر منہ میں بے اختیار پانی آ گیا۔ کہانیوں میں انوکھا ناٹک، جادو کی چھتری، عظیم درس گاہ اور زندہ لاش زبردست تھیں۔ نظم عید کا پیغام اچھی تھی۔ دھوپ چھاؤں اچھا جا رہا ہے۔ (اظہر عباس، سلوتر، چنیوٹ)

تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن ڈاکٹر رضوان ثاقب کی انوکھا ناٹک، انجم معراج کی عظیم درس گاہ اور فاروق حسن جالندھری کی عید شرارت پڑھ کر مزہ بھی بہت آیا اور بہت سے اسباق بھی ملے۔ (ندیم عباس، کامرہ)

یہ رسالہ ہر لحاظ سے لاجواب ہے۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ نظمیں اور لطیفے اچھے تھے۔ مجرم کون؟ کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ (عاشہ بانو، آنسہ بانو، فرح بانو، سارہ بانو، رضوان غوری، اٹک)

آپ کو چاہیے کہ مقبوضہ کشمیر کے سلسلے میں بھی کوئی لفظ لکھا کریں تاکہ کشمیری دوست یہ خیال نہ کریں کہ تعلیم و تربیت میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ (مریم، ماچسٹر، سیالکوٹ)

اس دفعہ ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور پر جادو کی چھتری، انوکھا ناٹک اور درس قرآن زبردست تحریریں تھیں۔ (اصغر، ورتمان، لاہور)

جنوری کا سرورق عید کی مناسبت سے بہترین رہا۔ کہانیاں جو اس دفعہ نمبر لے گئیں ان میں جادو کی چھتری، عظیم درس گاہ اور زندہ لاش تھیں۔ کھیلوں کی دنیا اچھی جا رہی ہے۔ (محمد طاہر عمران، اسماعیل خان)

یہ کہانیاں بہت پسند آئیں: جادو کی چھتری، عید شرارت اور زندہ لاش۔ دھوپ چھاؤں ناول تو بہت زبردست جا رہا ہے۔ نظموں میں سال نو آ گیا اور عید کا پیغام بہت اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا اور دلچسپ کھیل بھی تخریج کے بہت زبردست ہیں۔ (ذیشان حیدر، عمران حیدر، اسد حیدر، دانیال)

جنوری کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں جادو کی چھتری اور عید شرارت اچھی تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ تعلیم و تربیت کا تحقیقاتی نمبر ضرور شائع کریں۔ (ہاشم، ملتان، خولیان چھاؤنی)

جادو کی چھتری، انوکھا ناٹک، زندہ لاش، کھیلوں کی دنیا اور عید شرارت بے حد اچھی تحاریر تھیں۔ (محمد حسن نعمان، سلیم ریاض)

اس دفعہ سرورق بہت خوبصورت تھا اور نظم عید کا پیغام ہمیں بہت پسند آئی۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لیکن عظیم درس گاہ، دھوپ چھاؤں اور جادو کی چھتری بے حد اچھی تھیں۔ بلاعنوان اور کھیلوں کی دنیا بہت اچھے جا رہے ہیں۔ (زرش عمر، زرنین عمر، راولپنڈی چھاؤنی)

جنوری کا پورا رسالہ شاندار تھا۔ نظم "عید کا پیغام" بہت پسند آئی۔ کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر جادو کی چھتری اور عظیم درس گاہ بہت پسند آئیں۔ اس کے علاوہ کھیلوں کی دنیا، دلچسپ اور ناقابل یقین اور درس قرآن بہت اچھے جا رہے ہیں۔ چٹ پٹے مسالے دار کا سلسلہ بھی شروع کریں۔ (شمر، اقبال، محلہ اساعیلیہ شریف)

اس مرتبہ سرورق بہت دلچسپ تھی۔ ملائی کہانی، شرارتی لکیریں اور لطائف پڑھ کر بہت لطف اٹھایا۔ جب کہ دھوپ چھاؤں ناول دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا یا ثقافتی ذائقے کیونکہ ان کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ نئی پسندیدہ تحریر یہی کہانی میں انوکھا ناٹک پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ (ساجد محمود، گل، سرگودھا)

جنوری کا شمارہ بڑا دلچسپ تھا۔ کہانیوں میں خاص کر جادو کی چھتری، زندہ لاش اور عید شرارت بہت اچھی تھیں۔ گزارش ہے کہ سعید انور اور وسیم اکرم کے ریکارڈ شائع کریں (ضیاء الحسن ضیاء کوچہ شریف رکھی)

جنوری کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا مگر تھا زبردست۔ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ کہانیوں میں زندہ لاش، انوکھا انعام، ایک موم بتی اور عید شرارت بے حد اچھی تھیں (زبیر احمد خان جہلم چھاؤنی)

کہانیوں میں جادو کی چھتری، انوکھا انعام، ایک موم بتی، عظیم درس گاہ، زندہ لاش اور عید شرارت بہت عمدہ تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کے ریکارڈ ضرور شائع کریں (جمیل احمد بٹ لاہور)

اس دفعہ نئے سال کا شمارہ چمکتا دمکتا پہنچ گیا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں اچھی تھیں (عائشہ نقاش لاہور)

لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں پوری دنیا میں کوئی بھی ہمارے پیارے تعلیم و تربیت جیسا کوئی رسالہ نہیں۔ ہم سب گھر والے اس کا پورا ماہ شدت سے انتظار کرتے ہیں۔ اس کے سب سلسلے بہت ہی خوب جا رہے ہیں (کریم نواز خان حاجی پور شریف)

جنوری کا شمارہ پڑھ کے نہایت مزہ آیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر عید شرارت، جادو کی چھتری، عظیم درس گاہ۔ چٹ پٹے مسالے دار پھر سے شروع کریں (عظیم ارسلان جاوید چک خاصہ جہلم)

سرورق لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ جادو کی چھتری، ایک موم بتی، عظیم درس گاہ، عید شرارت اور دھوپ چھاؤں کی آٹھویں قسط بہت پسند آئیں۔ شرارتی لکیریں، مذاق اور لطائف پڑھ کر ہنسی بند نہ ہوئی۔ آپ مجرم کون؟ کا سلسلہ کیوں نہیں شروع کرتے؟؟ (نعم انجم لاہور)

جنوری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ جادو کی چھتری، انوکھا انعام اور عظیم درس گاہ بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کے ریکارڈ شائع کریں (حمیرا اسد پشاور)

ایک غلطی جو ٹائٹل میں سرزد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بچہ دوسرے بچے کو مٹھائی بائیں ہاتھ سے کھلا رہا ہے جبکہ ہمارا مذہب اور آپ کے تعلیم و تربیت کی تحریریں ہمیں دائیں ہاتھ سے کھانے اور کھلانے کا درس دیتی ہیں (محمد امام ڈیال)

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے رنگوں کی بہار آئی ہو۔ دیکھتے ہی دل خوش ہو گیا۔ کہانیوں میں انوکھا انعام، عظیم درس گاہ اور عید شرارت پسند آئیں۔ مضمون 11 دن والی عید بھی پسند آیا۔ فاروقی نے تو خوب عید منائی۔ دھوپ چھاؤں کی یہ قسط معلوماتی تھی۔ کھیل بغیر تحریک کے اچھا سلسلہ ہے۔ سال نو آ گیا نظم بہت زبردست تھی۔ کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع کریں (احمد علی بھلوال)

جنوری کا رسالہ دیکھ کر ہم عید کی سویاں کھانا بھول گئے۔ میرا مطلب ہے کہ پورے کا پورا تعلیم و تربیت عید کی سویوں کی طرح لذیذ تھا (عابد بشیر چیچہ وطنی)

جنوری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ کلر فل سرورق، عمدہ تحریروں اور قسط وار ناول نے تعلیم و تربیت کو چار چاند لگا دیے۔ اللہ تعالیٰ اس جارحانہ آغاز میں مزید نکھار پیدا کرے۔ کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کی آمد تیز مجاہدین آزادی کا کارواں پھر سے شروع ہونے کا شدت سے انتظار رہے گا (رضوان احمد خان کامرہ)

"مجرم کون؟" کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں اور "کھیلوں کی دنیا" میں چند نئے کھیل بھی متعارف کروائیں (اشفاق احمد لاہور چھاؤنی)

عید شرارت، کھیلوں کی دنیا، زندہ لاش، جادو کی چھتری اور انوکھا انعاب بے تحاشا پسند آئیں (محمد خرم منصور لاہور)

کھیلوں کی دنیا میں "یوسف یوحنا" کے بارے میں تفصیل دیں۔ دلچسپ اور ناقابل یقین ہمارا پسندیدہ سلسلہ ہے اسے جاری رکھیں۔ جنت رسا کیوں نہیں لکھ رہیں ضرور بتائیں۔ آپ بیت بازی اور "مجرم کون" شروع نہ کر کے ہمیں رنج و غم میں مبتلا کر رہے ہیں (اے زیڈ خان پٹھان)

کھیلوں کی دنیا میں دو عظیم وکٹ کیپر وسیم باری اور سلیم یوسف کے بارے میں ابن الطاف نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ صفحے کے آخر پر نئے سال کا کیلنڈر کلر فل تھا (محمد صالح جوئیہ ملتان)

کہانیوں میں ڈاکٹر رضوان ثاقب کی انوکھا انعاب اور سعید لخت کی جادو کی چھتری سپرہٹ رہیں۔ سائنس فکشن، کھیلوں کی دنیا، کارٹون کہانی اور دلچسپ اور ناقابل یقین اور دلچسپ سلسلے ہیں (قاضی غلام جعفر رضا ایذ آسے خان پور)

کھیلوں کی دنیا میں کرکٹ کے علاوہ بھی کوئی کھیل چھاپنے۔ نیز مئی میں سالنامہ ضرور شائع کریں (سیدہ ابصار کریم کراچی)

آپ تعلیم و تربیت کے پہلے صفحے پر 58واں سال لکھ دیتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ (علی ملک اسلام آباد)

٭ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے محبوب رسالے تعلیم و تربیت کی مسلسل اشاعت کا یہ 58واں سال ہے۔

عید شرارت، زندہ لاش اور جادو کی چھتری بہترین کہانیاں تھیں اس کے علاوہ وکٹ کیپر سلیم یوسف کے متعلق پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

مہاجرین کی آمد

1947ء

پاکستان بننے کے ساتھ ہی بھارت میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور انہیں ترکِ وطن پر مجبور کیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق ان مہاجرین کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ مہاجرین کے یہ قافلے بے سروسامانی کے عالم میں پیدل، بیل گاڑیوں، بسوں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے پاکستان میں وارد ہوتے تھے راستے میں ان پر ہر قسم کے ظلم و ستم توڑے جاتے۔ ان کو ہلاک کرنے کے لیے کنوؤں، جوہڑوں اور تالابوں میں زہر ڈالا گیا۔ غرض ہر قسم کی اذیت جو ان کو پہنچائی جا سکتی تھی پہنچائی گئی۔

قائدِ اعظم نے مہاجرین کا خود استقبال کیا اور اُن کی داستانِ غم سُن کر بے ساختہ آبدیدہ ہو گئے قائدِ اعظم کے کہنے پر مسلم لیگ طلبا کی تنظیموں، رضاکار تنظیموں اور دیگر عوام نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی آباد کاری میں ہر قسم کا تعاون کیا

مصور: محمود حسن رومی

قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل (سربراہ مملکت) 1947ء

قائدِ اعظم نے 14 اگست 1947ء پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ 11 ستمبر 1948ء کو اپنی وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔

قائدِ اعظم نے جب گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کیا تو اس وقت پاکستان مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ انتظامی مشینری کا کام، استحکام، معاشی بدحالی کا خاتمہ، مہاجرین کی آبادکاری اور اثاثوں کی تقسیم جیسے سنگین مسائل پر قابو پانا اس وقت کٹھن کام تھا۔ چونکہ پاکستان کا قیام ہندوؤں اور انگریزوں کی مرضی کے خلاف عمل میں آیا تھا اس لیے سیاسی استحکام بھی ایک انتہائی تشویشناک مسئلہ تھا۔ کشمیر، جوناگڑھ، ماناوادر اور مانگرول مسلم ریاستوں پر ہندوستان کا زبردستی قبضہ اور حیدرآباد پر متوقع حملہ بھی قائدِ اعظم کے لیے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ بہرحال قائدِ اعظم نے اپنی خداداد ذہانت اور بڑی لگن سے دن رات محنت کر کے کافی حد تک ان مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ حالانکہ ان دنوں ان کی صحت نہایت کمزور تھی۔

علاوہ ازیں قائدِ اعظم نے اسلامی جمہوریت، مساوات، اخوت اور سماجی انصاف کے اصولوں پر مبنی دستور بنانے پر زور دیا۔ وہ صاف ستھری انتظامیہ چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک سیاسی حکومتیں آتی جاتی رہیں گی لیکن ملک ہمیشہ قائم رہے گا۔ لہٰذا انتظامیہ کے افراد کو صرف ریاست کا خیرخواہ اور تابع فرمان رہنا چاہیے۔ وہ فوج کو بھی انتہائی منظم، مستعد، طاقتور و چوبند رکھنا چاہتے تھے۔

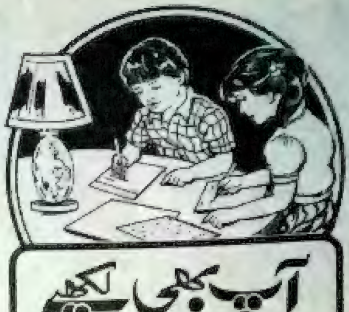

آپ بھی لکھیے

ناکام انتقام

تیمور خان غوری' واہ چھاؤنی

"تیمور کے بچے نہیں چھوڑوں گی تجھے۔ تیری تو بڑی پسلی ابھی برابر کرتی ہوں۔ بھاگتا کہاں ہے"۔

یہ سب کچھ سنتے ہی ہم کمرے سے بھاگے۔ جونہی صحن میں پہنچے تاکہ باہر نکلیں تو اچانک گیٹ کھلا اور بھائی جان اندر داخل ہوئے۔ اچانک بریک لگانے کی کوشش کی۔ مگر عین اسی لمحے انکشاف ہوا کہ بریک فیل ہو چکے ہیں۔ کیونکہ گھر میں سفیدی ہو رہی تھی اور کافی سارا چونا ملا پانی صحن کے اس حصے میں گرا ہوا تھا جہاں ہم اس وقت موجود تھے لہٰذا ہم بھائی جان سے فل اسپیڈ میں جا ٹکرائے۔ بھائی جان کے ہاتھ میں انڈے تھے۔ اب ہم جو ان سے ٹکرائے تو اچانک ان کا ہاتھ میرے بازو سے ٹکرایا اور انڈے فضا میں بکھر گئے۔ ابھی ہم بھاگنے کا سوچ رہے تھے کہ دو انڈے ہمارے چہرے پر لگے۔ جن میں سے ایک آنکھ پر اور دوسرا ناک پر۔ دونوں نے ٹوٹنے میں عافیت سمجھی اور ہمیں عارضی طور سونگھنے کی حس کو ختم کر دیا۔ مگر اس وقت انڈے فوراً ہماری ناک اور کان سے ہٹ گئے جب بھائی جان کا بھاری بھرکم ہاتھ ہمارے سر پر تھا۔ پھر اچانک کان چھوڑ دیا۔ ارے یہ کیا؟ یہ تو بھائی جان کی آواز تھی جس نے ہمارے حواس بحال کرنے کے بعد اوسان خطا کر دیے۔ پیچھے پیچھے فائزہ باجی بھی پہنچ گئیں۔ اور دونوں نے امداد باہمی سے اس ایتھلیٹ کی ٹھکائی لگائی جس نے انہیں تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔

آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ میں شاید باجی کی کوئی چیز لے کر بھاگا تھا۔ ایسا نہیں تھا بلکہ ہوا یوں کہ آج ہمارے خالہ زاد قاسم' عاطف' حنا اور نائلہ آرہے تھے۔ یہ سب ہماری طرح خاصی ہنگامہ خیز طبیعت کے مالک تھے۔ فائزہ باجی چونکہ ان کے لیے خاص ڈشیں بنا رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ ان کا نمک مرچ چکھ لیا جائے تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ لیکن جناب آج کل تو بھلے کا دور ہی نہیں۔ انہوں نے ہماری مخلصانہ پیش کش کو نا صرف حقی سے رد کر دیا بلکہ ہمیں سزا بھی سنا دی۔ جسے سنتے ہی ہم بھاگ لیے۔ لیکن ہائے ری قسمت "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا" نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ خیر ہم بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے بدلہ لینے کی ٹھانی لیکن فی الحال زخم سہلاتے اور ہڈیوں کے بچ جانے پر شکر ادا کرتے ہم اپنے کمرے میں پہنچے اور اس وقت کو کوسا جس وقت باجی کی "مدد" کا سوچا تھا۔ بدلہ لینے کا منصوبہ ہم نے اپنے خالہ زاد کے آنے تک اٹھا رکھا۔

خدا خدا کرکے شام ہوئی اور ہماری خالہ اور ان کے چار عدد بیٹے بیٹیاں عرف ہمارے کزنز کی آمد ہوئی۔ رات کا کھانا کھاتے ہی قاسم اور عاطف تو میرے ساتھ میرے کمرے میں چلے آئے جب کہ حنا اور نائلہ فائزہ باجی کے ساتھ ہو لیں۔ بھائی جان کے امتحان ہونے والے تھے چنانچہ وہ تو اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ "ارے ایہ تیرا منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ کیا کوئی تازہ "واردات" کی ہے؟" عاطف نے مجھ سے پوچھا اور ہم نے جو ایک شخص کے منہ سے ہمدردی کے دو بول سنے تو فوراً اپنا مقدمہ پیش کر دیا۔

"ہوئی تو واقعی زیادتی ہے اور ہم اس کا انتقام بھی لیں گے کیوں قاسم"۔

"ہاں یار واقعی ایک تو اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر فائزہ باجی کی بنائی ہوئی چیزیں چکھیں اور اوپر سے مار بھی کھائی۔ چلو خیر یہ بتاؤ اب کیا سوچا ہے تم نے؟" قاسم نے مجھ سے پوچھا۔

"سوچنا کیا ہے سب کچھ تم پر ڈال رکھا ہے" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں آج تو تھکے ہوئے ہیں کل سوچیں گے"۔

یہ کہتے ہوئے عاطف نے لائٹ آف کی اور ہم سب اپنے اپنے اصطبل پہنچ کر مردوں سے شرط باندھ کر سو گئے۔ صبح سویرے منہ اندھیرے یعنی کہ بارہ بجے اٹھتے ہی جو تازہ خبر سنی وہ یہ تھی کہ فائزہ باجی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک منانے جا رہی ہیں اور ساتھ میں آفت کی پرکالہ نائلہ اور شیطان کی خالہ حنا بھی جا رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی جہاں سکون کا سانس لیا وہاں انتقام کی بھی سوجھی۔ چنانچہ فوراً ایک چوکور میز کانفرنس منعقد کی گئی کافی بحث مباحثے کے بعد ہم ایک شان دار منصوبہ بنانے میں کام یاب ہو چکے تھے اور خوشی کے مارے گھی کے چراغ جلانے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن مہنگائی کے باعث بلب کو آن آف کر کے خوشی پوری کی۔ لیکن ہائے ری قسمت سارے منصوبے کا ستیاناس ہو گیا اور ہمیں پتا بھی نہ چلا۔ وہ اس طرح کہ شیطان کی خالہ یعنی حنا دروازے سے کان لگائے سارا منصوبہ سنتی رہی۔

خیر ہم اس بات سے بے خبر تھے۔ چنانچہ اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل کرتے ہوئے بازار سے جمال گوٹا خرید لائے اور یہ سوچا کہ رات کو اسے پکنک کی چیزوں میں ملا دیں گے۔ خدا خدا کر کے رات آئی اس دوران میں "نائلہ پارٹی" سے خلاف معمول ہمارے تعلقات کافی خوش گوار رہے۔ رات کے وقت جب قاسم نے لائن کلیئر ہونے کا سگنل دیا تو یہ دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ جمال گوٹے کی شیشیاں خالی ہیں۔ فوراً اجلاس طلب کیا گیا۔ جس میں موجودہ صورت حال کے پیش نظر منصوبے میں تبدیلی کر دی گئی۔ لیکن اس بات پر غور نہ کیا کہ شیشیاں خالی کس نے کی ہیں۔ ادھر ہمارا یہ منصوبہ بھی فائزہ باجی تک بذریعہ حنا اور نائلہ پہنچ چکا تھا۔

صبح سویرے جب باجی وغیرہ پکنک پر روانہ ہو گئیں تو ہم نے بھی پکنک پر جانے کا پروگرام بنا ڈالا اور جھٹ نکل کھڑے ہوئے۔ فوراً ایک ٹیکسی روکی اور اسے باجی کی کوچ کے پیچھے ڈال دیا۔ کلفٹن پہنچ کر ہم ایک جگہ چھپ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب باجی اور ان کی سہیلیاں ساحل کی سیر کو چلیں۔ آخر سیر کو چل پڑیں لیکن نائلہ چیزوں کے پاس وہیں پر رک گئی۔ ہمیں اپنا منصوبہ فیل ہوتا نظر آیا۔ کیونکہ جب تک نائلہ موجود تھی ہم وہاں سے وہ چیزیں نہیں اڑا سکتے تھے۔ اچانک مجھے ایک منصوبہ سوجھا اور فوراً ایک مداری جو کہ وہاں موجود تھا کو پیسے دے کر نائلہ کی طرف بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر نائلہ کو سامان سے ذرا دور کر کے سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھائے۔

جونہی مداری نے کرتب شروع کیا اور نائلہ اس طرف متوجہ ہوئی پیچھے سے عاطف سامان اٹھا لایا۔ "چلو بھئی آج اسی خوشی میں کراچی کی سیر کی جائے۔ کھانے کا مسئلہ تو حل ہو چکا ہے" میں نے کہا پھر ہم ٹیکسی لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ مختلف جگہوں پر پھرتے پھرتے قاسم کو ایک کی سوجھی اور مزار قائد سے ایک میل دور ٹیکسی رکوا کر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ "یہ کیا کیا تو نے اب کیا یہاں سے پیدل جائیں گے؟" میں نے قاسم سے کہا۔

"اور کیا کھانے کا مزہ تو تب ہی آتا ہے جب انسان تھکا ہوا ہو" قاسم نے اپنی تھیوری پیش کی۔ اگرچہ ہم اس کی تھیوری سے متفق نہیں تھے پھر بھی پیدل چلنا پڑا۔ مزار قائد پہنچنے کے بعد سب سے پہلے فاتحہ پڑھی پھر سوچا کہ کچھ پیٹ پوجا کر لی جائے۔ سامان کھولا تو سامنے تلی ہوئی چیزیں اور قیمہ وغیرہ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی ان کو دیکھ کر بھوک مزید چمکی لہٰذا سب نے ڈٹ کر کھایا۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے پیٹ میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ غور کیا تو عاطف اور قاسم بھی اسی کیفیت میں مبتلا تھے۔ چنانچہ سب نے فوراً "محفوظ مقامات" کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک تو تھکن سے برا حال اوپر سے "محفوظ مقامات" کی طرف دوڑنے ادھ موا کر دیا۔ تب یہ راز کھلا کہ کھانے میں جمال گوٹا شامل تھا اور ہمیں جان بوجھ کر کھانا اٹھانے دیا گیا۔ گویا ہمیں ٹریپ کیا گیا تھا۔

شام کو جب فائزہ باجی، نائلہ اور حنا گھر آئیں تو ہماری حالت دیکھ کر دل کھول کر ہنسیں (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

مزے کی بات

ضیاء الدین قادری، تھیوڈ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں چھوٹا سا تھا۔ ایک دن ہماری امی نے باجی کو قریبی دہی والے سے لسی لانے کے لیے بھیجا۔ باجی نے بالٹی اٹھائی اور جانے کے لیے پر تولے۔ میں بھی قریب ہی منتظر کھڑا تھا لہٰذا سب کام چھوڑ چھاڑ جھٹ باجی کے ساتھ ہو لیا۔ باجی

نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہوئی رفتار رکھی تاکہ میں تھک کر گھر واپس چلا جاؤں۔ مگر میں ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ آخر کار باجی نے جب دیکھا کہ میں کسی صورت بھی پیچھا نہیں چھوڑوں گا تو انہوں نے اپنی رفتار کم کی۔ پھولی ہوئی سانسوں کو درست کیا اور مجھے نصیحت کی کہ دیکھو اب آ ہی گئے ہو تو وہاں جا کر بدتمیزی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ حالانکہ یہ خصوصیت ان کی اپنی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ڈیرہ آ گیا۔ اچانک کچھ خوفناک آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ باجی جن کا دعویٰ تھا کہ وہ تیس مار خان کی استانی رہ چکی ہیں کی گھگھی بندھ گئی۔ دراصل یہ دو خوفناک کتوں کی گرجدار آوازیں تھیں جو ہماری آمد پر ہمیں بڑے ہی وحشت ناک انداز میں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر تھوڑا اطمینان ہوا کہ وہ دونوں بندھے ہوئے تھے۔ آخر کار ایک خاتون باہر آئی۔ اس نے پہلے کتوں کو دیکھا جو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور کسی بھی لمحے ان کی کوشش کامیاب ہو جاتی تو ہمارا اللہ ہی حافظ تھا۔ پھر خاتون نے ہماری طرف دیکھا ہماری حالت پر رحم کرتے ہوئے خاتون نے زوردار آواز میں کتوں کو "خاموش" کہا۔ وہ فوراً خاموش ہو گئے۔ ہماری جان میں جان آئی۔ وہ ہماری دور پار کی خالہ تھیں پھر وہ ہمیں پیار کرتے ہوئے گھر میں لے گئیں۔

خالہ نے ہمیں ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پلائی۔ پھر بالٹی لسی کی بھر کر دی اور اس کے بعد وہ باجی سے گھر کے حالات پوچھنے لگیں۔ میں بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اچانک میری نظر نزدیکی آموں کے باغ پر پڑی۔ جہاں تین چار لڑکیاں جھولا جھول رہی تھیں۔ پھر میں نے باجی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے دم بخود ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے خالہ سے جھولا جھولنے کی اجازت مانگی جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ بس پھر کیا تھا باجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فٹ چوکڑیاں بھرتی ہوئی ایسے بھاگی جیسے بھینس رسا تڑوا کر بھاگتی ہے۔ میں پیچھے سے باجی باجی پکارتا رہ گیا۔ میں روتا منہ بسورتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک میری باجی بھاگتے بھاگتے غائب ہو گئی۔ تی ہاں غائب ہو گئی۔ جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو یا وہ دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ میں نے جنوں پریوں کی کہانیاں سنی تھیں کہ کس طرح جن شہزادیوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ مگر میری باجی تو شہزادی نہیں تھی۔ میں زور زور سے رونے لگا۔

اچانک مجھے باجی کے دلدوز نعرے سنائی دیے۔ جھولا جھولنے والی لڑکیاں جھولا چھوڑ چھاڑ کر اس جگہ پہنچ چکی تھیں۔ میں بھی روتا پیٹتا وہاں پہنچا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کیونکہ میری باجی پانی کے کھال میں گری ہوئی تھی۔ کھال میں پانی بہت تھوڑا تھا مگر کیچڑ بہت تھی۔ باجی کیچڑ میں لت پت عجیب سماں پیش کر رہی تھی اور تقریباً قوس قزح کے تمام رنگ اس پر منقش ہو چکے تھے۔ لڑکیاں بھی بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھیں۔ کیونکہ باجی وہاں مہمان تھی۔ انہوں نے مل کر باجی کو تالاب سے باہر نکالا پھر وہ باجی کو لے کر نل پر گئیں اور وہاں باجی نے خوب مسل مسل کر کیچڑ کا پیراہن اتارا۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں باجی لڑکیوں کے ساتھ جھولا جھولنے لگی۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور آموں کے پیڑ پر چڑھ کر کیریاں توڑ توڑ کر کھانا اور جیبیں بھرنا شروع کر دیں۔ سارا دن کھیلنے کودنے میں گزر گیا۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ آخر جب سورج مشرق میں منہ چھپانے کی تیاری کرنے لگا تو میں نے ریں ریں شروع کر دی۔ میری ریں ریں باجی کو ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ انہیں احساس ہوا کہ وقت کافی بیت چکا ہے۔ باجی نے جلدی سے میرا ہاتھ تھاما۔ لسی کی بالٹی اٹھائی اور گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ ہمارے گھر میں داخل ہونے تک مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ امی جان گھر میں پریشان ہم دونوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ جوں ہی انہوں نے ہمارے حلیوں کو دیکھا تو فوراً جوتا اتار لیا۔ میں بھاگ کر اسٹور میں چھپ گیا۔ امی نے باجی کی خوب دھنائی کی مگر مجھے چھوڑ دیا۔ باجی نے جوتے کھائے اور میں نے کھٹی میٹھی کیریاں۔ ہے نا مزے کی بات!! (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

ہمسائے

[illegible]

اویس کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ دروازے کی دستک نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے دلی کے ساتھ اٹھا' دروازہ کھولا۔ سامنے ناصر کو کھڑے دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ ناصر اپنا چھوٹا سا آئس بکس لیے کھڑا تھا۔ "اویس بھائی! پشاور سے میری دادی اماں آئی ہیں۔ اس

وقت کسی بھی دکان پر برف نہیں مل رہی۔ امی نے کہا ہے کہ آپ کے پاس برف یا ٹھنڈا پانی ہو تو دے دیں"۔

ابھی اویس کوئی سخت سا جواب دینے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی "بیٹے کون ہے؟"

وہ وہیں سے تلخ لہجے میں بولا "ناصر ہے برف لینے آیا ہے"۔

"تو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ برف تو کافی ہے، جتنی اسے ضرورت ہے دے دو"۔

اویس نے بڑی جھنجلاہٹ کے ساتھ فریج کھولا اور برف ناصر کے آئس بکس میں بھر دی اور دوبارہ مطالعہ کرنے لگا۔ مگر اب اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ جھنجلاہٹ کے آثار اب بھی اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اسے اپنے پڑوسیوں سے سخت چڑ تھی۔ "جب دیکھو کچھ نہ کچھ لینے کے لیے آجاتے ہیں۔ ابھی برف لے گئے ہیں ذرا دیر بعد پھر آئیں گے کہ ہری مرچیں دے دو، لہسن، پیاز دے دو۔ جیسے یہ گھر نہیں کوئی جنرل اسٹور ہے"۔ اس نے نفرت سے سر کو جھٹکا دیا۔

اس کے ذہن میں ان خیالات کا لاوا پک رہا تھا۔ اسی لیے اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔ "اویس بیٹے! ذرا میری ٹانگیں تو دبا دو... شدید درد ہو رہا ہے"۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ امی گرمی کے باوجود کانپ رہی ہیں۔

شام کو ابو دفتر سے آئے۔ انھیں یہ بات معلوم ہوئی تو فوراً جا کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد ملیریا بتایا اور ضروری ہدایات دے کر واپس چلا گیا۔ امی کے بخار کی وجہ سے تینوں بھائی ساری شرارتیں بھول گئے۔ انھوں نے امی کی ذمہ داریاں آپس میں بانٹ لیں۔ اسی لیے بغیر دستک کے دروازہ کھلا۔ اندر داخل ہونے والی ناصر کی امی تھیں۔ انھوں نے آتے ہی ذیشان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ذیشان بیٹے! ذرا قینچی تو لانا۔ الشاں کی فراک کاٹ کر واپس بھجوا دوں گی" "پھر ذرا ٹھہر کر بولیں "امی کہاں ہیں؟"

ذیشان نے دھیرے سے کہا "امی کو تو بہت بخار ہے"۔

"ارے تم نے مجھے کیوں نہ خبر کی" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے امی کے کمرے کی طرف چل دیں۔ دواؤں سے امی کو قدرے آرام آ گیا تھا۔ انھوں نے غنودگی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ اویس ان کے قریب بیٹھا سوچ رہا تھا "امی تو بخار میں مبتلا ہیں، شام ہونے والی ہے کھانے کا کیا ہوگا؟ پھر اسے خیال آیا "ذیشان آملیٹ تو بنا ہی لیتا ہے۔ دو پیالی چائے۔ ڈبل روٹی کھا لیں گے"۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ناصر کی امی اندر داخل ہوئیں۔

"عائشہ بہن! کیسی ہو؟ تمہاری طبیعت خراب تھی تو مجھے کیوں نہ بلوا لیا" امی نے ان کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر وہ بولیں "تم بھی عجیب ہو۔ ایسی حالت میں بھی تکلف! میں تو اس کو اپنا گھر سمجھتی ہوں۔ جب جی چاہے چلی آتی ہوں، جس چیز کی ضرورت ہو منگوا لیتی ہوں اور ایک تم ہو کہ طبیعت خراب ہے بچے پریشان ہونے جا رہے ہیں اور مجھے کہا تک نہیں۔ بہن! مومن تو مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے"۔

مزاج پرسی کے بعد وہ اٹھ کر کچن میں داخل ہو گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے کھانا تیار کر دیا۔ جاتے ہوئے وہ کہنے لگیں۔ "فکر مت کرنا میں صبح آ کر ناشتہ بھی تیار کر دوں گی۔ بچوں کو اسکول اور بھائی صاحب کو دفتر بھی وقت پر بھجوا دوں گی"۔

صبح ناشتہ کرتے ہوئے اویس سوچ رہا تھا کہ اب میں ناصر کی امی کو آنٹی کہا کروں گا۔ اگر آج وہ ہمارا خیال نہ رکھتیں تو ہمیں کتنی پریشانی ہوتی! (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

فرضی یا حقیقی

سلمان لطیف، تی، ڈاکخانہ کریالہ

ہوم ورک کرتے ہوئے مجھے باغیچے میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ ہماری خالہ کی بیٹی ماریہ اور نیلی پری بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ نیلی ہم سب بہن بھائیوں سے چھوٹی ہے۔ نام تو اس کا نیلو فر ہے مگر ہم اسے نیلی پری کہتے ہیں۔ ماریہ نے مسکراتے ہوئے پری سے کہا "مجھے کل ابو نے بہت خوبصورت گڑیا دی ہے"۔

میرے پاس بھی بے شمار گڑیاں ہیں۔ میں نے ابو سے گڑیا لانے کو کہا تھا لیکن ابو کہتے ہیں کہ میرے پاس وقت نہیں" نیلی

مایوسی سے بولی۔

ماریہ پھر کہنے لگی "نیلو تمہیں پتا ہے مجھے بھائی کتاب سے کہانیاں بھی سناتے ہیں اور صبح سویرے جب سیر کو جاتے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں"۔

"میرے بھائی جان تو مجھے کبھی کہانی نہیں سناتے۔ مجھے اپنی کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔ اور مجھے ہوم ورک کرواتے ہوئے مارتے بھی ہیں" نیلی کے لہجے سے ہی آنسو ٹپک رہے تھے۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کھڑکی سے کود کر جاؤں اور ہری کا منہ بند کر دوں۔ نہ جانے اس کے بعد اس نے کیا کچھ ماریہ سے کہا مگر مجھ میں تو اس سے زیادہ سننے کی جرات نہ تھی۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے نیلی یقیناً ہم سب گھر والوں کا خصوصی پیار چاہتی تھی مگر ہمارے گھر کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر کوئی اپنے مخصوص دائرے میں گھومتا چلا جا رہا ہے۔ دوسرے کے دائرے میں مداخلت ممنوع ہے۔ ابو جان ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ انہیں تو سونے اور کھانے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کاروبار کی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ کئی دن بعد ہم ابو سے کوئی بات کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ رات کو اس وقت گھر آتے ہیں جب ہم سب سو چکے ہوتے ہیں اور صبح جب ہم اسکول جاتے ہیں تب ابو سو رہے ہوتے ہیں۔ امی جان ایک اسکول ٹیچر ہیں ان کا رویہ ہم سب سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ایک استاد طالب علم سے رکھتا ہے۔ میں خود گیارہویں کلاس میں ہوں مجھ سے چھوٹے دونوں بہن بھائی نویں میں ہیں اور سب سے چھوٹی نیلی ابھی کلاس دوم میں ہے۔ اسکول سے واپس آکر ہم سب کھانا کھاتے ہیں۔ نماز پڑھ کر ہوم ورک کرتے ہیں۔ نیلی اگر کبھی مجھ سے کچھ پوچھے تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ پتی بات تو یہ ہے کہ نیلی کبھی اتنا سیدھا سوال نہیں کرتی۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کے سوال زہر لگتے ہیں۔

اس دن کے بعد میں نے اپنا رویہ بدلا۔ دوسرے ہی دن میں کالج سے آتے ہوئے ایک خوبصورت سی پنسل اور خرگوش کی شکل کا ربڑ خرید لایا۔ گھر آتے ہی میں نے نیلی کو آواز دی۔ وہ دونوں چیزیں پا کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ ہم تعلیم و تربیت بھی منگواتے ہیں۔ اب میں وہاں سے نیلی کو وہی دن کہانی بھی سناتا۔ جس دن وہ مجھ سے کہانی سننے کی فرمائش کرتی۔ اسے پیار سے ہوم ورک کروا دیتا۔ جب کبھی سیر کو جاتا تو میں نیلی کو بھی ساتھ لے جاتا۔ اس کی پسند کی گڑیا خریدنے میں اسے خود بازار لے گیا۔ اتنی ساری "گڑیاں" دیکھ کر اس نے خود ایک گڑیا کا انتخاب کیا۔ گڑیا کی قیمت مناسب تھی۔ میں نے پیسے گنے تو معلوم ہوا کہ ابھی کچھ اور بھی خریدا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک "ڈال ہاؤس" بھی لے لیا۔ میرے سلوک نے اسے ابو کی محبت کی کمی بھی محسوس نہ ہونے دی۔ ہمارے ابو ایسے سخت بھی نہیں ہیں مگر کاروبار میں وہ ایسے مصروف ہوتے ہیں کہ باقی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ یہ سب محنت بھی تو ہمارے لیے ہی کرتے ہیں۔

نیلی اب کلاس چہارم میں ہے۔ "تعلیم و تربیت" وہ بھی پڑھ لیتی ہے۔ اب جب یہ کہانی چھپے گی تو اسے جو خوشی ہوگی وہ مجھے بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ کہانی کو فرضی داستان سمجھتی ہے۔ اب یقیناً اسے پتا چل جائے گا کہ یہ ہماری ہی زندگی کے حقائق ہوتے ہیں۔ اس کے کردار زندہ ہوتے ہیں بالکل ایسے جیسے اس کہانی کے ہیں

(چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

[illegible]

عالم زیب حنیفہ، پشاور

جانوروں کے معاملے میں ہم کچھ زیادہ ہی بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔ کسی زمانے ایک کتا پالا تھا۔ اسے بھی زہر دے کر مارنا پڑا۔ امی کے مطابق بچپن میں ابو نے دو چوزے لے کر دیے تھے۔ وہ بھی ہم نے اپنے ہاتھوں میں مسل دیے۔ ایک تیتر بھی ہماری قید کا شکار رہ چکا ہے۔ جس کی کہانی نہایت دردناک ہے۔ ہوا یہ کہ ہمارے نوکر کے کمرے سے ایک دن ایک عدد تیتر برآمد ہوا۔ وہ بیچارا تو اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا مگر ہم امی سے ضد شروع کر دی کہ ہمیں وہ تیتر چاہیے۔ امی مان گئیں اگلے دن ابو ہمارے تیتر کے لیے ایک پنجرہ لے آئے۔ ہم نے کبھی کوئی چڑیا نہیں پالی تھی۔ اسی لیے ہمیں کافی مشکل پیش آئی۔ اس معاملے میں ہمارے ملازم صاحب بڑے عالم فاضل انسان ہیں۔ وہ اس کے لیے گندم لے آئے۔ ہم نے اس تیتر کو باقاعدگی سے خوراک پہنچانا شروع کر دی۔

اب اگلا مرحلہ اس کا نام رکھنے کا تھا جو نہایت پیچیدہ تھا۔ میں نے اس کا نام "چرگانو" رکھا۔ دراصل پشتو میں مرغ کو "چرگ" کہتے ہیں اور چرگانو کا مطلب ہوتا ہے چھوٹا مرغ رکھ دیا۔

ہم نے بڑی محنت سے اس کے لیے ایک خندق نما گھر بھی بنایا۔ جس میں ہم اسے صبح کے وقت باندھ دیتے۔ ایک دن ہم نے اسے کھیلنے کے لیے کھول دیا اور وہ اڑ گیا!! بس ہمارے لیے تو ایک مصیبت بن گئی۔ ہم سوچنے لگے کہ ساری محنت خاک میں مل گئی۔ خیر ہم نے اپنے ملازم کو اس کے پیچھے لگایا اور اس بیچارے نے ایک دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد چرگانو کو ایک جھاڑی سے نکال لیا۔ اب ہم نے اسے اچھی طرح پنجرے سے باندھ دیا۔ پھر دو دن بعد نہ جانے ہمیں کیا سوجھی کہ ہم نے اسے شام ہی میں نہلا دیا۔ بیچارے کو کتنا برا لگا ہو گا۔ ہمیں بعد میں اندازہ ہوا کہ ہم نے کس قسم کا کام کیا ہے۔ رات کو ہم اسے آخری دفعہ دیکھنے گئے۔ ہمیں معلوم ہوتا تو ہم جی بھر کر اسے دیکھتے پھر باہر شدید سردی کی وجہ سے جلدی ہی اندر بھاگ آئے اور اس بیچارے کا خیال بھی نہ کیا جو شاید سردی سے ٹھٹھرا رہا تھا۔ اگلے دن جب ہم اسکول سے واپس آئے اور امی سے پوچھا کہ ہمارا چرگانو کہاں ہے تو امی نے قدرے خوشی سے ہمیں بتایا کہ وہ مر چکا ہے۔

ہمیں یہ سن کر شدید دکھ ہوا۔ ہماری امی بھی کچھ خاص خوش نہ تھیں مگر خوشی انہیں اس پر تھی کہ ان کا قول سچ ثابت ہوا تھا یعنی "تم جانوروں کے معاملے میں نہایت خوش قسمت ہو"۔ امی ہی کے مطابق ہم نے ایک ٹکٹ گھر کھول رکھا ہے۔ جو بھی جانور یہاں آتا ہے اللہ کے پاس بہت کم عرصے میں پہنچ جاتا ہے! (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

سوری امی جان!

غلام مصطفیٰ قادری، لاہور

ایک دن شگاف چیخ بلند ہوئی۔ لوگ صورتحال جاننے کے لیے باہر کی طرف بھاگے۔ یاسر زمین پر بے سدھ لیٹا تھا۔ دادی اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رو رہی تھیں۔ سب پریشان تھے کہ چنگے بھلے یاسر کو اچانک کیا ہو گیا۔ ابو فوراً اسے ہسپتال لے گئے۔

یاسر کو پتنگ بازی کا بے حد شوق تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ چھت پر چڑھ جاتا اور سورج غروب ہونے پر ہی آتا۔ یاسر کے گھر کی چھت دیگر گھروں سے ذرا نیچی تھی۔ چھت کے چاروں طرف منڈیر بنی ہوئی تھی۔ یاسر گلی کی جانب والی منڈیر پر کھڑے ہو کر پتنگ اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن یاسر کی امی کو ایک لڑکے نے بتایا کہ یاسر منڈیر پر کھڑے ہو کر پتنگ اڑاتا ہے جس سے اس کے گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یاسر کی امی نے دادی کو یہ بات بتائی۔ دادی یہ سن کر بڑی پریشان ہوئیں اور انہوں نے یاسر سے پوچھا تو یاسر نے کہا "دادی جان! ہمارے گھر کے پاس کئی لڑکے منڈیروں پر کھڑے ہو کر پتنگ اڑاتے ہیں۔ کیا انہیں گرنے کا خوف نہیں ہوتا؟؟"

"نہیں بیٹا! ایسے نہیں سوچتے۔ ان سب کا عمل غلط ہے۔ خدانخواستہ اگر گر جائیں تو یقیناً ہڈی پسلی ٹوٹ جائے"۔

"بس دادی جان بس! مجھے چھت پر پتنگ اڑانے کا مزہ نہیں آتا۔ دوسرے گھروں کی دیواریں اتنی اونچی ہوتی ہیں کہ سامنے کچھ نظر نہیں آتا لہٰذا منڈیر پر کھڑے ہونا پڑتا ہے" یاسر یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ آیا۔ حسب معمول یاسر نے اس دن بھی پتنگ بازی کا سامان پکڑا اور چھت پر چلا گیا۔ بسنت چونکہ قریب تھی۔ اس لیے خوب رونق تھی۔ یاسر دادی کے منع کرنے کے باوجود منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ کافی کٹی ہوئی پتنگیں نیچے کی طرف آ رہی تھیں اور ان کی ڈوریں بھی لٹک رہی تھیں۔ یاسر انہی کی طرف متوجہ تھا۔ ایک پتنگ کی ڈور ذرا اوپر تھی۔ اسے پکڑنے کے لیے اس نے تھوڑا سا اونچا ہونا چاہا۔ وہ پکڑنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن اس کوشش میں اس کا توازن بگڑ گیا۔ یاسر نے سنبھلنے کی بڑی کوشش کی لیکن بے سود اور وہ چیخ مار کر گلی میں گر پڑا۔

ہوش آیا تو اس نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھ دیں اور کہا "بیٹا! تم خوش قسمت ہو کہ بچ گئے ورنہ گرنے والوں کی کوئی نہ کوئی ہڈی پسلی ضرور ٹوٹ جاتی ہے۔ اسے اللہ کی مدد جانو۔ والدین اور دادی کا کہا مانا کرو۔ وہ تمہارے بھلے کے لیے ہی سوچتے ہیں"۔ یاسر نے شرمندگی سے نظریں جھکا کر کہا۔ "سوری امی جان" (چھٹا انعام 50 روپے کی کتابیں)

پتنگ بازی

1 نویدا سلم کداور جھاؤنی (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

2 [illegible] (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

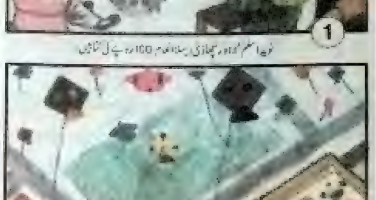

3 [illegible] (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

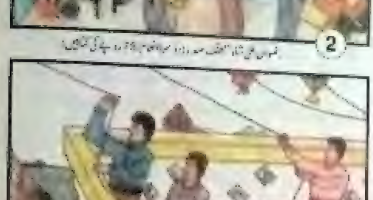

4 محمد عثمان [illegible] (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

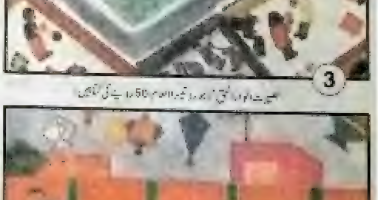

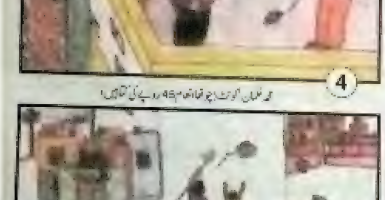

5 محمد [illegible] ساہی وال (پانچواں انعام 40 روپے کی کتابیں)

6 [illegible] (چھٹا انعام 35 روپے کی کتابیں)

ان نونہال مصوروں کی تصویریں بھی اچھی تھیں: سید حسن نواز سرگودھا۔ مشروز ذبیر حافظ آباد۔ محمد تیمور شکیل جہلم چھاؤنی۔ کومل ریاض شیخوپورہ۔ زوہیب ریاض چھ۔ شیخوپورہ۔ افق پرویز اسلام آباد۔ محمد عاقب آغا لاہور۔ شیر نواز گل ارمڑیان۔ محمد عدیل بیگ ساہی وال۔ شگفتہ ارم پشاور۔ بلال ارشد باجوہ راول پنڈی۔ عائشہ نقاش لاہور۔ اقرا انجم لاہور۔ نورین جنید فیصل آباد۔ فرح قریشی 103 ج ب برگ۔ جہانزیب سلطان حافظ آباد۔ سیف الرحمان عتیق بھلوال۔ عمیر عزیز میرپور خاص۔ فاکہہ ریاض ساہی وال۔ سدرہ نسیم سرگودھا۔ شمارہ عارق بیسرور۔ قاسم اعظم بھٹی گوجرانوالہ۔ خولہ جمشید لاہور۔ محمد سرفراز اقبال لاہور۔ عبیرہ شہد لاہور چھاؤنی۔ صوبیہ انور عارف والا۔ غالب حسین گوجرانوالہ۔ اصغر علی انصاری چک 59۔ ای بی عارف والا۔ محسن رضا گل لاہور۔ سعدیہ ذکا اسلام آباد۔ سدرہ سلیم لاہور۔ طیبہ عزیز مغل حسن ابدال۔ عفیفہ سعدیہ فیصل آباد۔ فیضان احمد کراچی۔ روبی زاہد مظفر آباد۔ سدرہ مسعود منڈی لاہو گی۔ ایلہ کلثوم کیانی راول پنڈی۔ ڈاکہ کلثوم کیانی راول پنڈی۔ مریم جاوید لاہور۔ محمد فیضان ناصر فیصل آباد۔

[illegible]

آخری تاریخ [illegible]

آخری تاریخ [illegible]

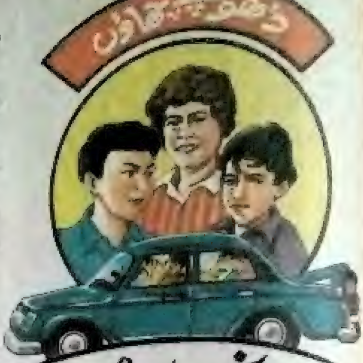

انجام

آخری قسط

سید نظر زیدی

پولیس کے دونوں سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد بستی کے لوگ آہستہ آہستہ پر سکون ہو گئے تھے لیکن عین اسی وقت قسطانی صاحب کارپوریشن کے اس عملے کو ساتھ لیے ہوئے وہاں پہنچ گئے جو اجازت کے بغیر بنائے ہوئے مکان گراتا ہے۔ اس سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مکانوں کے مالکوں کو کارپوریشن کی طرف سے کافی دن پہلے نوٹس دیا جاتا ہے کہ وہ ناجائز طور پر بنائے ہوئے مکانوں کو چھوڑ کر چلے جائیں اور انھیں اپنے ہاتھوں سے گرا دیں۔ جب ایسے مکانوں کے مالک نوٹس کی پروا نہیں کرتے تو کارپوریشن کے ملازم آکر خود گرا دیتے ہیں۔ لیکن قسطانی صاحب کو اپنی دولت اور بڑے افسروں سے جان پہچان پر کچھ ایسا غرور تھا کہ انھوں نے قانون قاعدے کی بالکل پروا نہ کی۔ غریب مزدوروں کے مکان گرانے کے لیے یوں پہنچ گئے گویا وہ اس ملک کے بادشاہ ہوں۔ اس وقت وہ بڑے رعب میں تھے۔ انھوں نے پستول والی پیٹی کندھے پر لٹکا رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی لیے ہوئے تھے۔

انھیں یقین تھا کہ کارپوریشن کے عملے کو دیکھتے ہی بستی میں کہرام مچ جائے گا اور لوگ رو رو کر ان سے درخواست کریں گے کہ ان کے مکان نہ گرائے جائیں، لیکن اس کے بالکل الٹ ہوا یہ کہ ان لوگوں کو دیکھتے ہی پوری بستی میں جوش پھیل گیا۔ گویا سانڈ کو کسی نے سرخ کپڑا دکھا دیا ہو۔ لوگ لاٹھیاں اور ڈنڈے ہاتھوں میں لیے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے اور ایسے خوفناک انداز میں نعرے لگانے لگے جیسے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیں گے۔

کارپوریشن کے ملازموں اور قسطانی نے یہ حالت دیکھی تو خوف سے ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔ قسطانی نے پستول نکال کر رعب جمانے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ لبلبی دباتے اینٹ کا ایک ٹکڑا اس زور سے ان کے سینے پر لگا کہ وہ گر گئے اور پستول ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ کارپوریشن کے ملازموں نے یہ حال دیکھا تو پلٹ کر ایسی تیزی سے بھاگے کہ طوفان میل کا انجن بھی کیا بھاگتا ہو گا۔ لوگوں کا ہجوم بھی چیختا چلاتا ان کے پیچھے بھاگا اور پھر اس ہجوم کا رخ قسطانی اور صدیقی صاحب کی عالی شان کوٹھیوں کی طرف ہو گیا۔ غصے میں بھرے ہوئے لوگوں کا یہ ہجوم اس وقت سمندری طوفان کی لہر کی طرح آگے بڑھ رہا تھا اور زخمی شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

صدیقی صاحب، توحید، توصیف اور گھر کے سب آدمی شور کی آواز سن کر کوٹھی کے گیٹ پر آکھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ چودھری اور اس کے دونوں بیٹے کلو اور للو بھی تھے۔

صدیقی صاحب اور ان کے گھر والے تو شاید ابھی یہ تک نہ سمجھ سکے تھے کہ یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں اور اس طرف کیوں بھاگے چلے آرہے ہیں، لیکن چودھری اس خطرے سے پوری طرح آگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں صدیقی صاحب اور ان کے گھر والوں سے درخواست کی کہ وہ فوراً کوٹھی کی پچھلی طرف چلے جائیں اور جلدی سے

اپنی سفید قمیص اتار کر اپنی لاٹھی پر جھنڈے کی طرح ٹانگ لی۔ کلو اور للو نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر یہ تینوں کوٹھی کے گیٹ سے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی قمیصوں کو زور زور سے یوں ہلانے لگے جیسے ہجوم کو اس طرف آنے سے منع کر رہے ہوں۔ ان تینوں کی یہ وہی قمیصیں تھیں جو صدیقی صاحب نے بنا کر دی تھیں۔

ہجوم جس تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ غصے میں بھرے ہوئے لوگ ان کمزور سے اشاروں کی بالکل پروا نہ کریں گے اور صدیقی صاحب کی کوٹھی میں گھس کر توڑ پھوڑ شروع کر دیں گے۔ لیکن جب یہ لوگ اتنے فاصلے پر آ گئے جہاں سے ایک دوسرے کو پہچان سکتے تھے تو ہجوم کے آگے چلنے والے نوجوانوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو صدیقی صاحب کی کوٹھی کی طرف بڑھنے سے دور کر دیا اور قسطانی صاحب کی کوٹھی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور آن کی آن میں ہجوم کا رخ اس طرف ہو گیا۔

چودھری ماجے کا پورا جسم پسینے میں تر ہو گیا تھا اور اس کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑک رہا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ شاید غصے میں بھرے ہوئے لوگ اس کی یہ درخواست ٹھکرا دیں گے کہ صدیقی صاحب کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے لیکن جب ہجوم کا رخ مڑ گیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ ایک دم مسکرا پڑا۔ شاید آج اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ جب اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ خطرہ ٹل چکا ہے تو

وہ قبلے کی طرف منہ کر کے اسی جگہ سجدے میں گر پڑا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اس کی عاجزانہ دعاؤں کی لاج رکھ لی۔

صدیقی صاحب کی کوٹھی کو چھوڑ کر غصے میں بھرا ہوا ہجوم قسطانی صاحب کی اس کوٹھی میں جا گھسا تھا جسے انہوں نے دلہن کی طرح سجا رکھا تھا اور اسے جلا کر اس طرح تباہ کر دیا جیسے اس میں کبھی کوئی انسان آباد ہی نہ ہوا تھا۔ اور تو اور باغیچے کے درختوں اور پودوں تک کو کاٹ کر برباد کر دیا۔

اس کوٹھی کو تباہ کرنے کے بعد یہی ہجوم جس میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے نعرے لگاتا ہوا قسطانی صاحب کی مل میں جا گھسا اور اس کا بھی یہی حشر کیا۔ اور یوں وہ قسطانی صاحب جنہیں اپنی دولت پر بڑا ہی غرور تھا بالکل کنگال ہو گئے۔

اس ہنگامے میں قسطانی اور ان کے خاندان کے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے، لیکن آٹھ دس دن میں ہی ان کے یہ زخم ٹھیک ہو گئے تھے۔ البتہ جو زخم ان کے دلوں پر لگے

بچے ان کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ نئی شان دار مل بالا ہوئی بات ہے ان کے پاس تو اب اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ کرائے کا کوئی معمولی سا مکان لے کر روکھی سوکھی روٹی کا انتظام ہی کر لیتے۔

صدیقی صاحب نے خدا ترسی کر کے انہیں اپنی کوٹھی کے دو تین کمرے دے دیے تھے اور پچھلے دو تین مہینوں سے وہ ان کے ہاں مہمان کے طور پر رہ رہے تھے۔

برخوردار چھوٹے قسطانی جعفری صاحب کی کوششوں سے اپنے ماں باپ کے پاس تو پہنچ چکے تھے' لیکن اغوا کرنے والے غنڈوں کے پاس رہ کر انہوں نے ان کی بہت سی باتیں سیکھ لی تھیں۔ گویا وہی قصہ ہوا تھا۔ ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ آوارہ گرد اور فضول خرچ تو پہلے ہی تھے اب انہیں لوگوں کو دھوکہ دینے کے گر بھی آگئے تھے اور یوں اپنے ماں باپ بلکہ پورے خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن گئے تھے۔

ان کے مقابلے میں توحید اور توصیف کی طبیعتوں پر نیکی کا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ قسطانی صاحب کے خاندان کی تباہی دیکھ کر توصیف نے خاص طور پر عبرت حاصل کی تھی اور اس نے اپنے آپ کو ایسا اچھا بنا لیا تھا کہ اپنا پرایا جو دیکھتا تھا تعریف کرتا تھا۔

بھلائی اور عزت حاصل کرنے کے سلسلے میں کچھ ایسا ہی حال ظفر اور انور کا تھا۔ صدیقی صاحب نے ان کے والد چودھری صاحب کو اپنی مل میں ایک بہت اچھا عہدہ دے دیا تھا۔ انہیں تین ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی اور رہنے کے لیے گھر مفت تھا۔ اب ان کے دونوں بچے ایک بہترین اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

توحید اور توصیف اکثر ان سے ملتے جلتے رہتے تھے اور چودھرانی جنہیں وہ واقعی اپنی چچی خیال کرتے تھے بڑی محبت سے ان کے لیے چائے تیار کرتی تھیں اور زردہ حلوہ اور چنے کھلاتی تھیں۔

ان سب کی یہ زندگی اتنی شان دار تھی کہ اس سے اچھی زندگی کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اللہ پاک نے اپنی خاص رحمت سے انہیں دنیا بھر کی نعمتیں دے رکھی تھیں اور سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑا احسان ان پر یہ تھا کہ ان کے دلوں میں سچی محبت ڈال دی تھی۔

صدیقی صاحب تو اب خاص طور پر مطمئن اور مسرور تھے۔ چودھری صاحب نے جو اب ماسٹر چودھری کی جگہ معراج دین چودھری کہلاتے تھے انہیں ہر قسم کے فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود انہوں نے مل کا انتظام ایسی خوبصورتی سے سنبھالا تھا کہ تمام مزدور بھی خوش تھے اور آمدنی بھی ڈیوڑھی ہو گئی تھی۔

صدیقی صاحب کو اگر ان دنوں کوئی چیز پریشان کرتی تھی تو وہ قسطانی صاحب اور ان کے خاندان کی تباہی کا خیال تھا۔ ویسے سچی بات تو یہ تھی کہ ان کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا وہ ان کے گناہوں کی سزا تھی لیکن صدیقی صاحب بے حد رحم دل آدمی تھے۔ جب بھی ان کا خیال اس طرف جاتا تھا وہ دکھی ہو جاتے تھے۔

آج بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ سہ پہر کی چائے ان لوگوں نے کوٹھی کے لان میں پی تھی جہاں سے قسطانی صاحب کی جلی ہوئی کوٹھی صاف نظر آتی تھی۔ صدیقی صاحب اسی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کا ذہن اس شان دار کوٹھی کی پہلی تصویر بنانے میں مصروف تھا۔ بالکل یوں جیسے کوئی بچہ کسی پھٹی ہوئی تصویر کے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

قسطانی صاحب نے انہیں چپ چپ دیکھا تو سوال کر لیا۔ "صدیقی صاحب! میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ کیا کوئی خاص معاملہ درپیش ہے؟"

"جی کوئی خاص بات نہیں۔ بس کبھی یہ خیال آجاتا ہے کہ ہماری زندگی کے معاملات کیسے عجیب ہیں۔ اس وقت یونہی آپ کی اس تباہ شدہ عالی شان دار کوٹھی کا خیال آگیا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے کیا شان تھی اس جگہ کی' لوگ پاس سے

گزرتا تھا تو خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا تھا لیکن اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کوئی کبھی رہا ہی نہ ہو!"

صدیقی صاحب نے رنج بھری آواز میں کہا "انسان کی زندگی بھی بالکل دھوپ چھاؤں کی طرح ہے کہ ابھی سورج چمک رہا ہے اور کچھ دیر بعد رات ہو گئی"

یہ بات سن کر قسطانی صاحب دردناک انداز میں ہنسے اور پھر اپنی جلی ہوئی کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "لیکن صدیقی صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا میرے گناہوں کی سزا ہے۔ بلکہ انصاف سے دیکھا جائے تو اللہ پاک نے پھر بھی میرے حال پر مہربانی کی ہے۔ گناہوں کے مقابلے میں سزا بالکل کم ہی ہے۔ میری سزا تو یہ تھی کہ میرے جسم پر پھٹا ہوا میلا لباس ہوتا اور میں گلی گلی بھیک مانگتا پھرتا"۔ یہ بات کہتے ہوئے قسطانی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

صدیقی صاحب نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اسے جو عزت اور آرام حاصل ہے وہ اس کی نیکیوں کا بدلہ ہے۔ یقین کیجیے کوئی انسان چاہے وہ کتنا بھی نیک اور شریف کیوں نہ ہو یہ بات نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں جو نعمتیں دی جاتی ہیں وہ اللہ پاک کا بخشا ہوا انعام ہوتا ہے"۔

"آپ بالکل درست فرماتے ہیں صدیقی صاحب، لیکن میں اس قدر مغرور ہو گیا تھا کہ میرے دل میں کبھی بھول کر بھی اس سچے مالک کا خیال نہ آتا تھا جس نے مجھے اور دنیا کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ ہاں اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں لیکن اب اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ میں تو اس قدر بے بس ہو گیا ہوں کہ کوئی معمولی نیکی بھی نہیں کر سکتا۔ بھکاریوں کی طرح آپ کے دروازے پر پڑا ہوں"۔ قسطانی صاحب نے کہا۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

صدیقی صاحب نے ان کی یہ حالت دیکھی تو بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت محبت سے ان کے

کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے "خدا کے لیے آپ ایسی باتیں نہ کریں قسطانی صاحب! نیکی کے لیے یہ بات ہرگز ضروری نہیں کہ انسان مال دار ہو بلکہ اس کے مقابلے میں یہ ایک سچائی ہے کہ مال دار لوگوں میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو جنت میں جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اونٹ کا سوئی کے ناک میں سے گزر جانا ممکن ہے لیکن مال دار کا جنت میں جانا مشکل ہے۔ یہی بات ہماری مقدس کتاب قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے۔ نیکی کے لیے دولت کی ضرورت نہیں بلکہ پاک دل کی ضرورت ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں اس مصیبت نے آپ کے دل کو ہر قسم کے برے خیالات سے پاک کر دیا ہے"۔

"کاش ایسا ہو جائے۔ صدیقی صاحب سچ عرض کرتا ہوں اگر ایسا ہو جائے تو میں خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھوں گا۔ اب تو میرا یہ حال ہے کہ دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ نہ دنیا کے لیے کچھ پلے میں ہے نہ عاقبت کے لیے"۔ قسطانی صاحب کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی

بھرّی لگ گئی اور انھوں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

صدیقی صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے اس پریشان حال ہمسائے کو کس طرح تسلی دیں لیکن پھر اچانک ہی ان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ خوش ہو کر بولے "قسطانی صاحب' مبارک ہو اللہ پاک کی رحمت نے آپ کے یہ آنسو موتی سمجھ کر چن لیے اور آپ کی بہتری کا ایسا سامان پیدا کر دیا کہ ان شاء اللہ آپ پہلے کی طرح پھر شان سے زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

یہ بات سن کر قسطانی صاحب نے جلدی سے صدیقی صاحب کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں۔ وہ کیسے؟ اور کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے؟

صدیقی صاحب نے رومال نکال کر اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا "پریشانی میں سچ مچ انسان کا ذہن کام نہیں کرتا۔ دیکھیے نا کیسی سامنے کی بات تھی لیکن نہ اس کا خیال آپ کے ذہن میں آیا نہ میرے۔ وہ بات یہ ہے کہ بے شک آپ کی کوٹھی اور اس کا قیمتی سامان جل گیا ہے لیکن اس کی زمین کا تو کچھ نہیں بگڑا اور میرے نزدیک یہ اب پہلے سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہے۔ ایک لاکھ روپے فی مرلہ تو میں پیش کر سکتا ہوں میرا خیال ہے اس رقم سے آپ کوئی چھوٹا موٹا کام ضرور کر سکتے ہیں۔

"بالکل" قسطانی صاحب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگے کہ یہ خیال خود ان کے ذہن میں کیوں نہیں آیا تھا۔ صدیقی صاحب یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے "ہمارا خیال ہے نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے"۔

صدیقی صاحب کے پاس اتنی بڑی رقم نقد موجود نہ تھی لیکن انھوں نے تین چار دن کے اندر ہی روپے کا انتظام کر لیا اور قسطانی صاحب نے اس رقم سے دھاگا تیار کرنے والی چھوٹی سی فیکٹری کی داغ بیل ڈال دی۔ مشینوں کے لیے آرڈر دے دیا گیا اور عمارت بننی شروع ہو گئی۔

قسطانی صاحب اب پہلے کے مقابلے میں بہت مطمئن تھے لیکن پھر بھی وہ زیادہ تر اسی حالت میں نظر آتے تھے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ دراصل انھیں اپنے بیٹے کی طرف سے بہت زیادہ فکر تھی۔ ان صاحب زادے کا حال یہ تھا کہ اب وہ بالکل ہی شتر بے مہار ہو گئے تھے۔ اگر قسطانی صاحب کبھی ٹوکتے تھے تو پلٹ کر جواب دیتے تھے اور گستاخی پر اتر آتے تھے۔ ان کی زندگی کا یہ ایسا دکھ تھا کہ اس کا علاج خدا کے سوا کسی کے پاس نہ تھا۔

اس وقت قسطانی صاحب اسی خیال میں اداس بیٹھے تھے کہ صدیقی صاحب، جعفری صاحب اور چودھری معراج دین باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ قسطانی صاحب پر نظر پڑی تو جعفری صاحب خوشی بھری آواز میں بولے "مبارک ہو قسطانی صاحب! خدا نے آپ کی سن لی اور آپ پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے!"

"جعفری صاحب! یہ سب آپ جیسے دوستوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میں تو اس قابل تھا کہ شہر کی گلیوں میں گدائی کرتا پھرتا" قسطانی صاحب رنج سے کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"ارے صاحب' آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ خدا نے آپ کو گدائی کے لیے نہیں شاہی کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان شاء اللہ سب بگڑے ہوئے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کیجیے" جعفری صاحب ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

قسطانی صاحب نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "جی وہ تو میں کرتا ہوں لیکن بعض معاملات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑے بہادر انسان کو بھی بے بس کر دیتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ اس لڑکے کی آوارہ مزاجی نے میری کمر توڑ دی ہے۔ صدیقی صاحب کی مہربانی سے میری بگڑی بات بن گئی ہے اور امید ہے تھوڑے دنوں میں ہی میری مالی حالت ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی لیکن سچ عرض کرتا ہوں' مجھے اس کی ذرا بھی خوشی نہیں۔ یوں محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے

اندھیرے نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے وہ بڑھتا ہی جا رہا ہے"۔

"آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں' یہ صدمہ انسان کو واقعی تباہ کر ڈالتا ہے لیکن عقل مندی یہ ہے کہ اسے دور کرنے اور بگڑی ہوئی بات کو سدھارنے کی کوشش کی جائے اور میں سمجھتا ہوں اگر صحیح طور پر کوشش کی جائے تو صاحبزادے صاحب کا سیدھے راستے پر آجانا کوئی مشکل بات نہیں" چودھری معراج دین نے کہا۔ اس وقت وہ نہایت شان دار سوٹ پہنے ہوئے تھے اور بے حد معزز اور رعب دار نظر آرہے تھے۔ اچھی خوراک اور اچھے لباس کی وجہ سے ان کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کر سکتا تھا کہ یہ وہی غریب مزدور ہے جو میلا چیکٹ تہبند اور پھٹا ہوا کرتا پہنے پھرا کرتا تھا۔

چودھری کی یہ بات سن کر سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی اپنے طور پر چھوٹے قسطانی کی عادتیں سنوارنے کے بارے میں غور کر چکے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تھی۔

چودھری نے کہا "جناب میں ایک جاہل آدمی ہوں لیکن یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چھوٹے قسطانی صاحب کی یہ حالت گھر کے خراب ماحول کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ہر وقت ریڈیو سننا' ٹیلی وژن اور فلمیں دیکھنا اور کار لے کر آوارہ گردی کرتے رہنا' یہی ان کی زندگی رہی ہے۔ اگر شروع ہی سے اچھے استاد انہیں تعلیم دیتے اور قسطانی صاحب انہیں اس قسم کی آزادی نہ دیتے تو یہ صاحبزادے بھی اسی طرح سمجھ دار اور نیک ہوتے جس طرح ماشاء اللہ ہمارے توصیف میاں اور توحید میاں ہیں"۔

"بے شک آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے چودھری صاحب' بے جا لاڈ پیار کر کے ہم نے خود اپنے بیٹے کو تباہ کیا ہے"۔ قسطانی صاحب نے کہا "لیکن خدا نے چاہا تو اب اس کی تعلیم اور تربیت پر پورا پورا دھیان دیں گے"۔

"بہرحال جو بات گزر گئی اب اس کا کیا افسوس۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا اب اس بچے کو کسی طرح ٹھیک کیا جا سکتا ہے؟" جعفری صاحب نے کہا۔ پھر ذرا دیر رک کر بولے "قسطانی صاحب قبلہ! اگر آپ گوارا کریں تو ایک ترکیب ہماری سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان صاحبزادے کو فوج یا پولیس میں بھرتی کرا دیں۔ ان دونوں محکموں میں نئے بھرتی ہونے والوں کی ٹریننگ ایسی عمدہ ہوتی ہے اور انہیں قاعدے قانون کا اس طرح پابند بنایا جاتا ہے کہ اچھے اچھوں کے بل نکل جاتے ہیں"۔

"محترم جعفری صاحب' آپ کی یہ تجویز بھی بہت شان دار ہے لیکن میرے ذہن میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ ان صاحبزادے کو فوراً کسی اور شہر میں بھیج دیا جائے اور وہاں کسی بہت اچھے تعلیمی ادارے میں داخل کروا کر اس کے ہوسٹل میں ان کے رہنے کا بندوبست کر دیا جائے۔ جب ان کا ماحول بالکل بدل جائے گا تو امید ہے ان کے خیالات اور عادتیں بھی بدل جائیں" چودھری صاحب نے تجویز پیش کی۔

"بھئی بہت شان دار! چودھری صاحب آپ نے واقعی نہایت عمدہ تجویز پیش کی ہے۔ اگر قسطانی صاحب یہ بات گوارا کر لیں تو امید ہے بچے کی حالت ضرور سدھر جائے گی!" صدیقی صاحب خوش ہو کر بولے۔

"خود میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ یہ تجویز بہت شان دار ہے اور ان شاء اللہ اس پر فوراً عمل کروں گا" قسطانی صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ اب ان کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کندھوں پر رکھا ہوا بھاری بوجھ اتر گیا ہے اور اب انہیں کسی قسم کی فکر نہیں۔

چودھری صاحب کے مشورے کے مطابق چھوٹے قسطانی کو راول پنڈی کے ایک بہت اچھے تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں تو ان کے بارے میں اچھی رپورٹیں نہ آتی تھیں لیکن اب ان کے پرنسپل اور استاد اطمینان ظاہر کرنے لگے تھے۔

قسطانی صاحب کی چھوٹی سی فیکٹری نے کام شروع کر

رہا تھا۔ انھوں نے عادتیں بھی بہت بدل لی تھیں۔ اب وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔ بالکل سادہ زندگی گزارتے تھے اور اپنی فیکٹری کے مزدوروں اور کارکنوں سے ایسا سلوک کرتے تھے جیسا باپ اپنے بچوں سے کرتا ہے۔ چنانچہ اس اچھے سلوک کی وجہ سے بالکل شروع ہی میں نفع حاصل ہونے لگا تھا۔ اور یوں گنتی کے چند دنوں ہی میں ساری پریشانیاں دور ہو گئی تھیں۔

نیکی کے کاموں میں قسطانی صاحب نے ایک بہت اچھا کام یہ کیا تھا کہ جس طرح کوشش کر کے کچی آبادی کے مزدوروں کے گھر گروا دینے کا حکم جاری کروایا تھا' اسی طرح کوشش کر کے یہ حکم منسوخ کروا دیا اور اس کے بعد مزدوروں کی اس انجمن کو باقاعدہ مالی مدد دینے لگے تھے جو اس بستی کے مزدوروں کو زمین کے مالکانہ حقوق دلوانے کی کوشش کرتی تھی' چنانچہ ان اچھے کاموں کی وجہ سے وہی مزدور اب سچے دل سے ان کی عزت کرنے لگے تھے جو انھیں ایک بہت ہی ظالم اور لالچی آدمی خیال کرتے تھے۔

پنجاب میں نئی حکومت بننے کے بعد صوبے کے گورنر اور وزیر اعلیٰ کی طرف سے جب یہ اعلان کیا گیا کہ کچی آبادیوں میں رہنے والے لوگوں کو گھروں کو زمینیں دے دی جائیں گی تو اس انجمن نے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں اور اس کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ اس بستی کو یہ حقوق فوراً ہی مل گئے تھے۔

آج اس سلسلے میں ایک شان دار جلسہ تھا۔ مزدوروں نے اپنے اس جلسے میں جو حکومت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا جعفری صاحب' صدیقی صاحب اور قسطانی صاحب کو خاص طور پر بلایا تھا۔ وہ سنہری ہار پہنے ہوئے نہایت عزت سے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

جلسہ شروع ہونے کا وقت آیا تو مزدوروں کی انجمن کے سیکرٹری نے اسٹیج پر آکر قسطانی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس جلسے کی صدارت کریں لیکن قسطانی صاحب نے یہ بات منظور نہ کی۔ انھوں نے اسٹیج پر آکر کہا۔

"حضرات! اس بات کے لیے میں سچے دل سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے اس عزت کے قابل سمجھا لیکن میں خیال کرتا ہوں اس عزت کا صحیح حق دار ہمارا بیٹا توحید ہے۔ یہی وہ نیک دل اور سمجھ دار لڑکا ہے جس نے اس وقت نیکی کا کام کیا تھا جب ہم سب خود غرضی اور لالچ کے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے۔ میں توحید بیٹے سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صدارت کی کرسی سنبھالیں اور جلسے کی کارروائی شروع کریں!"

قسطانی صاحب کی اس بات کو سب نے دل سے پسند کیا۔ جلسے کے حاضرین نے اونچی آواز میں "توحید میاں! زندہ باد۔ ہمارا محسن! زندہ باد"۔ کے نعرے لگائے اور جب توحید صدارت کی کرسی پر بیٹھا تو اسے پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ اس وقت چودھری معراج دین اور ان کے بیٹوں کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کے سانولے چہروں سے اجالا پھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بالکل یوں جیسے مشرق سے سورج نکل رہا ہو۔ صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر توحید نے اپنے بزرگوں اور جلسے میں شامل ہونے والوں کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس کی عزت بڑھائی۔ اس کے بعد بستی کے لوگوں کی تکلیفوں کا ذکر کیا۔ "خدا کا شکر ہے اب یہ تکلیفیں کسی حد تک دور ہو گئی ہیں لیکن میرا خیال ہے ابھی ایک ایسی پریشانی باقی ہے جس کا دور ہونا ضروری ہے اور وہ ہے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہونا۔ میری تجویز ہے کہ اس بستی میں ایک اچھا اسکول کھولا جائے"۔

اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور جلسہ ایک بار پھر "توحید میاں! زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ (ختم شد)

بلا عنوان

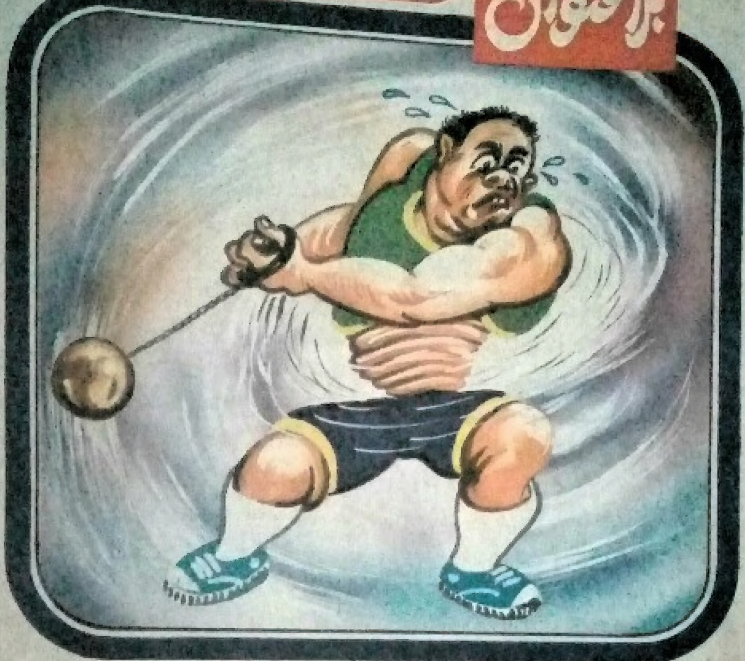

جنوری 1999ء کے بلا عنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- حیدر اکرام گوجرانوالہ (شطرنج اک بہانہ مچھلی اصل نشانہ) پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- خالد قلیل ملتان (چال چلوں یا مچھلی پکڑوں) دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- محمد رحمان اکرم ملتان (نظر شطرنج پر ذہن مچھلیوں میں) تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- ماریہ آمنہ مہتاب لاہور (کھیل بگلوں کا فیصلہ مچھلیوں کا) چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- صابرہ رحمان لاہور (پرانے شکاری نیا جال) پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- عدنان حسن عابدی کراچی (ارے بھی تو مات نہیں) چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

ILLUSTRATED FS CLASSICS

ILLUSTRATED CLASSICS

السٹریٹڈ کلاسکس

فیروز سنز نے پہلی بار ایسے تصویری کلاسکس کا دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رنگا رنگ تصویروں کے ذریعے نامور ہیروز (HEROES) کے کارنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ بچے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی مزیدار فلم دیکھ رہے ہوں۔

بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان تصویری کلاسکوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم ★ ٹیپو سلطان ★ شیر شاہ سوری

یہ تینوں کلاسکس چھپ چکے ہیں

اس کے علاوہ دوسرے ہیروز HEROES پر کام ہو رہا ہے۔

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

خود پڑھیے۔ تحفے میں دیجیے

قیمت فی کلاسک ۳۰/۰۰ روپے